
ہر اک مقام سے آگے گزر گیا مہ نو
کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو
اقبال
صفا
دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد

دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کا علمی، دینی، دعوتی، ادبی سہ ماہی رسالہ

صفا

شوال • ذوقعدہ • ذوالحجہ ۱۴۱۹ھ
جنوری ❖ فروری ❖ مارچ، ۱۹۹۹ء

شمارہ ۳۰

مدیر تحریر	مدیر مسئول	مدیر اعلیٰ
خالد سیف اللہ رحمانی	بدرالحسن القاسمی	محمد رضوان القاسمی

معاونین

سرفراز احمد قاسمی ❖ احمد عبدالمجیب قاسمی ندوی

سالانہ Rs. 80/- • معاون خصوصی Rs. 500/-
فی شمارہ Rs. 25/-

انتخاب

"اللہ پاک نے امتِ محمدیہ کو امتِ وسط و عدل فرمایا ہے، اس لئے اس کی حریت، ہوا پرستی اور دماغی اور علمی انتشار اور انسانی غلامی، الغرض تمام عیوب سے پاک ہے، وہ تو صرف قانونِ الٰہی کی اتباع کی دعوت دیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ عقائد و اعمال میں قانونِ الٰہی کے آگے سر جھکا دو اور کسی انسان کی اتباع کا بھی حکم دیتا ہے تو نہ اس جہت سے کہ وہ ایک انسان ہے بلکہ اس جہت سے کہ وہ منجانب اللہ خدا کے حکم کو جاری کرنے والا اور امر و نواہی سے مطلع کرنے والا ہے۔

اسلامی حریت یہ ہے کہ بڑے سے بڑا شخص بھی، حتّٰی کہ خلیفۂ وقت بھی اگر خلافِ شریعت حکم دے تو فوراً اس کو ٹھکرا دینا چاہیے، یہ کیوں؟ یہ صرف اس لئے کہ اس صورت میں خدا کی غلامی نہ ہوگی، بلکہ ایک انسان کی غلامی ہوگی، نیز اگر نفس کسی ایسے امر کی خواہش کرے جو خلافِ منشاء اسلام ہو تو فوراً ٹھکرا دینا چاہیے، یہ کیوں؟ یہ صرف اس لئے کہ اس میں نفسِ انسانی اور ہوائے شیطانی کی غلامی ہوگی، اس طرح ایک انسان نہیں، بلکہ ہزاروں انسانوں کی کونسل نے اگر کسی ایسے قانون کا اجراء کیا جو حکمِ خداوندی کے خلاف ہو تو اس کو بھی ٹھکرا دو، کیونکہ پھر انسانوں کی غلامی نہ ہو۔

پس اسلام نے اگر دنیا کو حریت کی دعوت دی ہے اور غلامی کی مذمت کی ہے تو اس حریت کی جو محمودہ ہو اور انسانوں کو انسانِ کامل بناتی ہو اور اس کی صورت یہی ہے کہ صرف قوانینِ الٰہیہ کی اتباع کی جائے اور تمام انسانوں کی اس خواہش کو جو اسلام کے منشار کے خلاف ہوں ان کو ایک ایک کر کے اٹھا کر پھینک دیا جائے۔"

(حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ)

از خطبۂ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء ہند، منعقدہ مراد آباد

فہرست

انتخاب	حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ	
افتتاحیہ	محمد رضوان القاسمی	۴
قرآن وحدیث :		
چلنے کے آداب۔ کتاب وسنت کی روشنی میں	مولانا عبدالمجید قاسمی	۸
ضیافت۔ اسوۂ ابراہیمی اور تعلیماتِ نبویؐ	مولانا احمد عبدالمجیب ندوی	۱۵
فقہ اسلامی :		
مرابحہ۔ غیر سودی بینک کاری کی اہم بنیاد	مولانا سید حسنین احمد ندوی	۲۲
بحث وتحقیق :		
حدیث کے مقبول ونامقبول ہونے کے اصول	خالد سیف اللہ رحمانی	۳۹
تذکیرو اصلاح :		
زندگی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے تجربات	محمد رضوان القاسمی	۵۲
شعروادب :		
درود وسلام	مولانا مفتی محمد مصطفےٰ مفتاحی	۶۳
مولانا سجادؒ کی یاد میں (نظم)	الحاج محمد شفیع تمنائی پھلواروی	۶۵
خمار کی شاعری۔ ایک مطالعہ	محمد رضوان القاسمی	۶۶
شخصیات :		
مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ......	خالد سیف اللہ رحمانی	۷۹
بانی امارت شرعیہ کی شخصیت کے چند امتیازی پہلو	مولانا بدرالحسن القاسمی	۹۵
سوال وجواب	دارالافتاء دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد	۱۱۲
خبرنامہ	دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد ـــــــ سرفراز احمد قاسمی	۱۱۸

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

افتتاحیہ

اس وقت عالم اسلام نہایت مشکل حالات سے دو چار ہے، ایک طرف کرد مسلمان ہیں جو ہر چہار جانب سے آزمائشوں اور ابتلاؤں سے گزر رہے ہیں، اور کوئی ان کے زخم پر مرہم رکھنے والا نہیں، دوسری طرف عراق کی مظلوم اور ستم رسیدہ عوام ہیں جو بیرونی دشمنوں سے زیادہ خود اپنے ہی حکمرانوں کے پنجۂ استبداد سے کچلے جارہے ہیں، عراقی حکمراں اور مغربی ممالک جنگ کا نمائشی میچ کھیل رہے ہیں امریکہ اور مغربی ممالک جزیرۃ العرب پر اپنا دباؤ قائم رکھنے کے لئے عراق پر مصنوعی حملے کررہے ہیں اور عراقی حکمراں اندرونی طور پر ان کا آلۂ کار بنے ہوئے ہیں، اسرائیل اپنے معاہدہ سے مکر چکا ہے، اور فلسطین کی آزاد مملکت ابھی بھی ایک خواب ہے، جو معاہدہ کے مطابق مئی ۱۹۹۹ء میں تشکیل پائی تھی اور ان سب سے زیادہ تکلیف دہ صورت حال کوسووبحران کی ہے بلقان کا یہ علاقہ غالب ترین مسلم اکثریت کا ہے لیکن یہاں سربوں کا غلبہ ہے اور انہوں نے نہتے مسلمانوں پر ستم کے پہاڑ ڈھا رکھے ہیں قتل عام کیا جارہا ہے، آبروریزی کے واقعات پیش آرہے ہیں، بستی کی بستی تباہ و ویران کردی جاتی ہے اور بے قصور شہریوں کو اس بات پر مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ اپنے گھر بار چھوڑ کر پڑوسی ملکوں میں پناہ لیں، کوسووکے البانوی نسل مسلمان پہلے تو مکمل آزادی کے طلب گار تھے، لیکن یورپین صلح کنندگان کی خواہش پر اس بات پر بھی آمادہ ہوگئے ہیں کہ وہ اندرون ملک خود اختیاری ہی پر اکتفا کرلیں گے بشرطیکہ صلح کی شرائط پر عمل کو یقینی بنانے کے لئے ناٹو کے فوجی دستے موجود رہیں، کیونکہ سربوں کی ہٹ دھرمی اور عیاری کا وہ بار بار تجربہ کرچکے ہیں، لیکن افسوس کہ سرب نمائندوں نے اس کو بھی قبول نہ کیا، بہر حال اللہ کا شکر ہے کہ ناٹو اس بار کسی قدر جرأت مندانہ قدم اٹھاتے ہوئے سربوں کے خلاف عملی کارروائی بھی کررہے ہیں، اور بوسنیا میں مغربی ممالک نے جس بے عملی کا مظاہرہ کیا تھا، بمقابلہ اس کے کوسووکے مسائل کو حل کرنے میں ایک حد تک جرأت سے کام لیا گیا ہے

خواہ اس کی وجہ مغربی اتحادیوں کے مقابلہ روس کے سابق اتحادیوں اور خاص کر یوگوسلادیہ کے اٹھتے ہوئے سر کو جھکانا مقصود ہو، یا واقعی وہ کوسووو کے مظلوم عوام کی مدد کرنے میں مخلص ہوں، اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ سربوں کی سرکشی اور سرتابی کا علاج ہو رہا ہے، ایسے مواقع پر عالم اسلام کی مجرمانہ خاموشی بلکہ بعض مسلم ممالک کی طرف سے سربوں کی تائید اس درجہ افسوسناک بات ہے کہ اس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے، دعا کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ان مظلوم مسلمانوں کی مدد فرمائے۔

ادھر چند سالوں سے بقرعید کے موقعہ سے فرقہ پرست عناصر کی طرف سے قربانی کے مسئلہ کو غلط ڈھنگ سے پیش کر کے فرقہ وارانہ منافرت پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اس سال چونکہ دس ذی الحجہ کو جین جینتی بھی آگئی تھی، اس لئے اس فتنہ کو اور زیادہ ابھارنے کی کوشش کی گئی لیکن اللہ کا شکر ہے کہ مسلمانوں نے شعور سے کام لیا، اور بقرعید خیر و عافیت سے گزر گئی۔

مسلمانوں کا موقف اس سلسلہ میں اصولی اور واضح ہے کہ قربانی ان کا بنیادی مذہبی حق ہے، اس لئے ان کو اس سے محروم نہیں کیا جاسکتا، اس سلسلہ میں فرقہ پرست عناصر کا تشدد کا راستہ اختیار کرنا، اور مسلمانوں کو قربانی سے روکنا، ملک کے ساتھ بدخواہی، اور امن و امان کے ساتھ عداوت ہی کے مترادف ہوگا، ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اہل دانش مسئلہ کے صحیح پس منظر کو برادران وطن کے سامنے پیش کریں، اور فرقہ پرستوں کے پروپیگنڈوں سے ان کو متاثر نہ ہونے دیں۔

ہندوستانی مسلمان اس وقت صالح اور باشعور قیادت کے جس قدر محتاج ہیں، شاید کبھی رہے ہوں، فرقہ پرست قوتیں بام اقتدار تک رسائی حاصل کر چکی ہیں، اور مسلمانوں کے باہمی انتشار و افتراق نے ملک میں ان کو ایک بے اثر اور بے وزن عنصر بنا کر رکھ دیا ہے، ان حالات میں جن شخصیتوں کو امت میں کچھ اعتبار و اعتماد حاصل ہے، ان کا وجود بہت ہی غنیمت ہے، ایسی شخصیتوں میں سر فہرست مخدومی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی ذات گرامی ہے، حضرت مولانا یوں تو پورے عالم اسلام کے لئے ایک قیمتی اثاثہ ہیں، لیکن امت اسلامیہ ہند کے لئے تو ان کا وجود نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے، مولانا کے بعد بظاہر کوئی ایسی شخصیت

نظر نہیں آتی، جو امت کے تمام طبقوں اور جماعتوں کے لئے نقطۂ اتفاق کا درجہ رکھتی ہو حالانکہ موجود حالات میں مسلمانانِ ہند اس کے بہت زیادہ محتاج ہیں۔

گذشتہ دنوں مولانا کی علالت کی اطلاع نے پورے ہندوستان میں عوام و خواص کو فکرمند کر دیا، ہندوستان اور ہندوستان سے باہر جگہ جگہ دعائیں ہوئیں، اہلِ تعلق کے خطوط فون کا ایک تانتا سا بندھ گیا، اللہ کا شکر ہے کہ ان دعاؤں اور تمناؤں کا اثر ظاہر ہوا اور اب مولانا صحت یاب ہو رہے ہیں، اللہ تعالیٰ تادیر مسلمانانِ ہند اور عالمِ اسلام پر آپ کا سایۂ عاطفت قائم رکھے اور آپ کی عمر دراز فرمائے۔

مسلمانانِ ہند کے لئے یہ امر باعثِ افتخار ہے کہ مولانا کو حکومت دبئی اور حکومت برونی نے نہایت اعزاز و احترام کے ساتھ باوقار عالمی ایوارڈ پیش کیا ہے، جو ایک خطیر رقم پر مشتمل ہے جس کو مولانا نے تعلیمی اور دعوتی کاموں کے لئے وقف فرما دیا ہے، درحقیقت یہ مولانا کا اعزاز نہیں بلکہ خود اس ایوارڈ کا اعزاز ہے جسے مولانا نے قبول فرمایا ہے، اس سے پہلے آپ کو شاہ فیصل ایوارڈ بھی دیا جا چکا ہے

اس وقت ملتِ اسلامیہ ہند کا سفینہ جن ناخداؤں کے ہاتھ ہے، ان میں ایک اہم ترین شخصیت حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم قاضی شریعت امارتِ شرعیہ اڑیسہ بہار کی بھی ہے، جو گذشتہ ایک سال سے سخت علیل تھے مولانا کی علالت نے امت کے تمام اصاغر و اکابر کو بے چین کر دیا تھا اور ملک کے طول و عرض میں آپ کی صحت و شفا کے لئے مسلسل دعائیں ہو رہی تھیں، علاج کا سلسلہ بھی جاری و ساری تھا، الحمد للہ اب گذشتہ کئی مہینوں سے غیر معمولی افاقہ ہوا ہے، یہاں تک کہ آپ نے بعض اسفار بھی کئے اور کئی اہم علمی کام جو عرصہ سے وقت اور موقعہ کے انتظار میں تشنۂ تکمیل تھے کو آپ نے حالیہ دنوں میں انجام دیا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ مولانا کی ذات مسلمانانِ ہند کے لئے بے بدل ہے اور ہم سب کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحتِ کاملہ عاجلہ عطا فرمائے اور آپ سے زیادہ سے زیادہ اور تادیر امت کو نفع پہونچتا رہے۔

جب صفا کا یہ شمارہ قارئین کے ہاتھوں میں پہونچے گا، اس وقت اسلامک فقہ اکیڈمی کا گیارہواں فقہی سمینار امارتِ شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ میں چل رہا ہو گا، اسلامک فقہ اکیڈمی نے کم

عرصہ میں جو عظیم علمی، تحقیقی اور فقہی کام انجام دیئے ہیں، شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے، اکیڈمی کا یہ گیارہواں سمینار دو اہم معاشرتی مسائل ولایت اور کفائت نیز ایک اہم اصولی مسئلہ حدیث ضعیف کے اعتبار، عدم اعتبار جیسے موضوعات پر منعقد ہو رہا ہے، امید کی جانی چاہئے کہ یہ سمینار ان مسائل کے بارے میں موجودہ حالات کے پس منظر میں امت کی صحیح رہنمائی کرے گا اور عدل و اعتدال کا راستہ دکھائے گا، یہ سمینار پہلے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہونے والا تھا، لیکن حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ کی اچانک علالت کی وجہ سے سمینار کا مقام تبدیل کر دیا گیا ہے۔

امارت شرعیہ میں اس سمینار سے متصل ہی ۲۰، ۲۱ اپریل کو مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بانی امارت شرعیہ کی شخصیت اور خدمات پر بھی دو روزہ سمینار منعقد ہو رہا ہے، امت کی وحدت اور نظم امارت مولانا سجاد صاحب کے فکر اور مسائل کا خلاصہ ہیں، اور اس وقت مسلمانان ہند اس کے بہت ضرورت مند ہیں، ان حالات میں مولانا کی شخصیت پر اس سمینار کا انعقاد نہایت ہی برمحل اور بروقت ہے، اور امید ہے کہ اس سے مسلمانان ہند کو ایک نئی روشنی ملے گی، اللہ تعالیٰ ان سمیناروں کو کامیاب اور نتیجہ خیز فرمائے۔

۱۵ ذوالحجہ ۱۴۱۹ھ
۴ مارچ ۱۹۹۹ء بروز جمعرات

محمد رضوان القاسمی

مولانا عبد المجید صاحب قاسمی

چلنے کے آداب کتاب وسنت کی روشنی میں

جس طرح بات چیت متعلق احکام بیان کئے گئے ہیں، اسی طرح چلنے کے سلسلہ میں بھی ہدایات ملتی ہیں، جس پر عمل کرکے انسان دنیا میں بھی بھلائی حاصل کر سکتا ہے اور اللہ تعالےٰ کی رضا بھی پا سکتا ہے، انسان ہر وقت ہی کچھ نہ کچھ ضروریات سے دوچار ہوتا ہے اور اس کی تکمیل کے لئے ادھر ادھر آمد و رفت کرنی پڑتی ہے، چال ڈھال اور رکھ رکھاؤ سے بھی انسان کے اخلاق و عادات کا پتہ چلتا ہے، انسان کی رفتار دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے اخلاق و عادات کیسے ہیں، مثلاً اکڑ کر چلنا غرور و کبر کی علامت ہے لہٰذا یہ بات ضروری ہے کہ انسان اپنی چال اور طور طریقہ پر نظر رکھے، تاکہ دنیا اور آخرت کی ذلت و رسوائی سے محفوظ رہ سکے اور اللہ تعالےٰ کی خوشنودی حاصل کرکے کامیاب و کامران ہو سکے۔

میانہ روی

آدمی کو چاہیئے کہ وہ اکڑ کر نہ چلے، اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتے ہیں: "اور زمین میں اکڑ کر نہ چل (کہ اس طرح چل کر) نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ پہاڑوں تک اونچائی میں پہنچ سکتا ہے[1]"۔ غرض کہ اکڑ کر چلنے والے کو اللہ تعالےٰ پسند نہیں فرماتا، بندے کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ گھمنڈ اور تکبر کے ساتھ چلے اور اکڑ کر چل کر اپنی بڑائی جتائے، نیک بندوں کی یہ صفت نہیں ہوتی ہے، بلکہ قرآن مجید کے اندر اللہ کے نیک بندوں کی صفت بیان کی گئی ہے کہ: "اور رحمت والے خدا کے بندے وہ ہیں جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں[2]"۔ نرم روی سے چل کر بندہ اپنی عاجزی اور انکساری کو ظاہر کرتا ہے، جو ایک مومن بندہ کی صفت ہے ایسی

(۱) بنی اسرائیل - ۳۷۔ (۲) فرقان - ۶۳۔

چال اللہ کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ ہے، لہٰذا انسان کی رفتار کو متانت، سنجیدگی اور خاکساری کا آئینہ دار ہونا چاہیے اور اس طرح اکڑ کر نہیں چلنا چاہیے کہ غرور اور تکبر کا احساس ہو، چلنے میں قصداً سست رفتاری بھی مناسب نہیں کہ یہ کم ہمتی اور بزدلی کی دلیل ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ "حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ حسین نہیں دیکھا، گویا کہ چہرۂ مبارک میں سورج چمک رہا ہے اور میں نے آپؐ سے زیادہ تیز رفتار کسی کو نہیں دیکھا، گویا کہ زمین آپؐ کے لئے لپٹی جارہی ہے، ہم پوری کوشش کرتے، لیکن آپؐ کو نہ پاتے، نیز حضرت علی بن ابی طالبؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چلنے کی صفت اس طرح بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب چلتے تو جھک کر چلتے، گویا بلندی سے اتر رہے ہیں"(۱)۔ چلنے کا یہی طریقہ سب سے بہتر ہے، کیونکہ درمیانی چال ہے، نہ سست رفتاری ہے اور نہ ہی دوڑنا ہے تیز چلنے میں متانت اور وقار کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے۔

علامہ ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں چلنے کی دس قسمیں بیان کی ہیں، جن میں سے بعض مذموم ہیں (۱) ڈگ بھر بھر کر چلنا، گویا کہ لکڑی اٹھا رکھی ہے، یہ چال بیہودہ اور مذموم ہے (۲) پریشانی اور اضطراب کی چال چلنا، جیسے احمق اونٹ چلتا ہے، یہ چال بھی مذموم ہے، اس کا مطلب ہے کہ یہ کم عقل آدمی ہے، خصوصاً اگر چلتے چلتے دائیں بائیں دیکھتا جائے (۳) آرام سے چلنا، یہی رحمٰن کے بندوں کی چال ہے، "خدائے رحمٰن کے بندے جو زمین پر سکون سے چلتے ہیں"۔ یعنی بغیر تکبر کے سکون اور وقار سے چلتے ہیں (۴) دوڑنا (۵) رمل یعنی دوڑنے سے قدرے تیز (۶) نسلان یعنی چلنے والا نہ تھکتا ہو، اور نہ تکلیف دہ چال ہوتی ہے (۷) خوزلی، یعنی عورتوں کی طرح جھک جھک کر چلنا، اس میں انکسار نہیں ہوتا، بلکہ زنانہ پن پایا جاتا ہے (۸) قہقری، یعنی دوڑ سے قدرے کم (۹) حمزی، یعنی کود کر چلنا (۱۰) متکبرانہ چال(۲)۔

بہرحال اپنی رفتار میں متانت و سنجیدگی کا خیال ضروری ہے، اس بات کا خیال رکھنا چاہیے

---

(۱) شمائل ترمذی ص۲ و ص۳ باب ما جاء فی مشیۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

(۲) زاد المعاد ص۱۲۱۔

کہ بہر طور وقار کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔

جذبۂ نمائش نہ ہو

البتہ عورتیں چلیں تو اگر بجنے والے زیور، مثلاً پازیب، چھڑے یا جھانجھ وغیرہ پہن رکھی ہیں، تو چلنے میں پاؤں کو زمین پر زور سے نہ رکھیں، قرآن شریف میں صاف طور پر فرمایا گیا ہے کہ "اپنے پاؤں کو زمین پر مارتی نہ چلیں، کہ ان کا مخفی زیور معلوم ہو جائے"[1] ——— لہٰذا عورتوں کو چاہیئے کہ وہ چلنے میں پاؤں کو آہستہ زمین پر رکھیں، تاکہ پوشیدہ زیور وغیرہ ظاہر نہ ہو سکے، ممکن ہے کہ کوئی شیطان صفت ان کے پیچھے لگ جائے اور موقع پاکر کچھ گزند پہونچا دے، اس سے بچنا چاہیئے اور ویسے بھی پاؤں زور سے مار کر چلنا نسوانیت کے خلاف ہے، جو عورتوں کو قطعاً زیب نہیں دیتا۔

اسی طرح جب عورتیں گھر سے باہر نکلیں تو اپنے جسم کو چادر یا برقع سے چھپا کر نکلیں، سر سے پاؤں تک تمام حصہ ڈھکا رہنا چاہیئے اور کچھ حصہ منہ پر رہے، تاکہ ان کی شرافت کا اظہار ہو سکے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: "اے پیغمبر! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنے اوپر تھوڑی سی چادریں نیچے لٹکالیں، اس سے لگتا ہے کہ پہچانی پڑیں تو کوئی نہ ستاوے (یعنی لوگ جان لیں کہ یہ شریف خاتون ہیں، ان کو کوئی راستہ میں نہ چھیڑے"[2] ——— اس طرح عورتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ جب بھی گھر سے باہر نکلیں تو پردے کا ضرور اہتمام کریں اور راستہ چلنے میں ادھر ادھر نہ دیکھیں، بلکہ نگاہیں شرم سے جھکی رہیں، تاکہ معلوم ہو کہ حیادار اور شریف عورتیں ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے پیغمبر! ایمان والیوں کو کہہ دیجئے کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں اور اپنا ستر چھپائیں، اور اپنا سنگار نہ دکھائیں، مگر جو (فطرتاً) کھلا رہتا ہے اور اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں اور اپنا سنگار نہ دکھائیں، لیکن شوہر (وغیرہ محرم) کو"[3] ——— یعنی عورتوں کو چاہیئے کہ چلنے میں آنکھیں ذرا نیچی رکھیں اور ضرورتاً جو اعضا کھلے رہتے ہیں، مثلاً ہتھیلی، قدم، اس کے علاوہ تمام ستر کو چھپا کر رکھیں، اس فتنے کے دور میں چہرہ کو چھپانا بھی ضروری ہے اور چلنے میں ایسی روش اختیار کریں، جس سے ان کا سنگار ظاہر نہ ہونے پائے، البتہ شوہر اور دیگر محرم کے سامنے سنگار کو ظاہر کر سکتی ہیں۔ اسی طرح عورتوں کو خوشبو لگا کر باہر نہیں نکلنا چاہیئے، اس سے لوگوں کا ذہن اور خیال

---

(۱) نور - ۳۱ - (۲) احزاب - ۵۹ - (۳) نور - ۳۱ -

اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور شیطان طرح طرح کے وسوسے دلوں میں ڈالتا ہے، اسی طرح عورتوں کو اگر مرد کے ساتھ چلنے کا اتفاق ہو تو عورتوں کو چاہئے کہ وہ مرد سے الگ ہو کر چلیں، مردوں کے ساتھ مل کر نہیں چلنا چاہئے اور خاص کر عورتوں کو چاہئے کہ وہ چلنے میں راستے کے وسط میں نہ چلیں، بلکہ ایک طرف الگ ہو کر چلیں"[1] ——— اس طرح چلنا عورتوں کے لئے زیادہ عفت و پاک دامنی کا باعث ہوتا ہے۔

جوتے پہن کر چلنا

چلنے میں پیروں کی حفاظت کا خاص خیال رکھنا چاہئے اور اس کے لئے جوتے وغیرہ پہننا چاہئے اس سے پیروں کی حفاظت بھی ہوتی ہے اور طہارت و پاکیزگی کا باعث بھی ہوتا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جوتا پہننے والا بھی ایک طرح کا سوار ہوتا ہے[2] اس لئے جوتا وغیرہ پہن کر چلنے کا اہتمام کرنا چاہئے، اور جوتا دونوں قدموں میں ہونا چاہئے" ایک قدم میں جوتا پہن کر نہیں چلنا چاہئے"[3] اگر صرف ایک پیر میں جوتا یا چپل پہن کر چلیں گے تو لوگ اسے احمق اور بے وقوف سمجھیں گے اور ویسے بھی یہ ادب اور وقار کے خلاف ہے" البتہ دو چار قدم چلنے میں کوئی حرج نہیں ہے" اور جب جوتا پہنا جائے تو پہلے داہنے پاؤں میں پہننا چاہئے اور جب نکالنا ہو تو پہلے بائیں پاؤں کو نکالنا چاہئے"[4] چونکہ جوتا وغیرہ پہننا کوئی لازمی امر نہیں ہے، محض پیروں کی حفاظت اور طہارت و پاکیزگی مقصود ہے، اس لئے اگر جوتا وغیرہ پہنا جائے تو دونوں قدموں میں پہنا جائے، ورنہ دونوں میں نہ پہنا جائے، صرف ایک قدم میں پہننا مناسب نہیں ہے۔

---

(۱) ابوداؤد ۲/۱۴۱، باب مشی النساء فی الطریق۔

(۲) ابوداؤد ۲/۵۷۰، باب فی الانتعال

(۳) ترمذی ۲/۳۰۶، باب ما جاء فی کراہیۃ المشی فی النعل الواحد۔

(۴) مسلم ۲/۱۹۶ استحباب لبس النعال الخ

چلنے کے مختلف آداب

اگر پیدل چل رہے ہوں تو راستے کے ایک طرف ہو کر چلیں، خصوصاً جب کہ مصروف راستوں سے چلیں، تا کہ حادثات سے محفوظ رہ سکیں، اور دوسری سواریوں کے چلنے میں آسانی اور سہولت ہو سکے، اگر راستہ بدلنے کی ضرورت پیش آئے اور راستہ کے دوسری جانب جانے کی ضرورت ہو تو سواریوں کو دیکھ کر ہی اطمینان سے راستہ بدلیں اور احتیاط سے کام لیں، تا کہ محفوظ طریقے سے جا سکیں، اسی طرح راستہ میں ادھر ادھر نظریں نہ دوڑائیں، بلکہ سیدھے اپنے راستہ پر نظر رکھتے ہوئے چلیں، اس سے بہت سے خطرات سے محفوظ رہ سکیں گے اور اگر سواری سے چل رہے ہوں تو راستے اور سواری کے قانون کی پابندی ضرور کریں، تا کہ حادثات سے بچ سکیں، مثلاً شہروں میں چلنے کے لئے سڑک کا قانون ہوتا ہے، ٹھہرنے اور آگے بڑھنے کے لئے لال اور ہری روشنی کا انتظام ہوتا ہے، تو اگر سامنے "لال روشنی" (جو ٹھہرنے اور رکنے کی علامت ہے) آئے تو رک جائیں اور ہری روشنی" (جو آگے بڑھنے اور چلنے کی علامت ہے) آئے تو چلیں، اسی طرح اگر ہم بس وغیرہ میں سفر کر رہے ہیں تو ٹکٹ لے کر ہی سفر کریں، بغیر ٹکٹ کے سفر نہ کریں کہ یہ قانوناً اور شرعاً حرام ہے، اگر مختص سیٹ ہو تو اسی طریقہ پر بیٹھیں، اگر کوئی کمزور اور ضعیف آدمی آپ کے پاس کھڑے ہیں اور آپ بیٹھے ہیں تو اٹھ کر ان کو سیٹ پر بیٹھنے کا موقع دیں اور خود کھڑے ہو جائیں، اس سے آپ با ادب اور خلیق تصور کئے جائیں گے، وہ خوش ہو کر آپ کا احسان مند ہوگا اور آپ کے اخلاق سے متأثر ہوگا۔ اسی طرح راستہ چلنے میں جہاں تک ممکن ہو راہ گیروں کا حق ادا کریں، یعنی سوار ہیں تو پیدل چلنے والے کو سلام کریں اور پیدل چل رہے ہیں تو بیٹھے ہوئے کو سلام کریں[1]۔

چلتے ہوئے راستہ میں اگر کوئی برائی دیکھیں تو حتی الوسع اس کو دور کرنے کی کوشش

---

(۱) مسلم ۲/۲۱۲، ترمذی ۲/۹۹، زاد المعاد ۲/۲۱۲۔

کریں اور لوگوں کو نیک باتوں کی تلقین کرتے رہیں، مثلاً نماز کا وقت ہو جائے تو نماز کی دعوت دیں، اگر کوئی غیر مسلم ساتھ ہے تو حسب موقع اس کو دین کی دعوت پیش کریں راستہ میں کوئی تکلیف دہ چیز پڑی ہوئی ہے تو اس کو ہٹا دیں اور نظر کو فواحش اور منکرات سے بچاتے ہوئے اور آنکھوں کو نیچی کر کے چلیں، ادھر ادھر دیکھنا شرافت کے خلاف ہے، چلنے میں اگر بڑے لوگ بھی ساتھ ہوں تو ان سے آگے نہ بڑھیں، بلکہ ان کے پیچھے چلیں، آگے چلنا بے ادبی سمجھی جاتی ہے، اور جو حدیث میں آتا ہے کہ صحابہؓ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پیچھے سے آگے کر دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ "پیچھے فرشتوں کے لئے چھوڑ دو"، تو یہ حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا، عام طور پر بڑوں سے آگے نہیں چلنا چاہیئے۔

اسی طرح اگر جنازہ کے ساتھ چل رہے ہوں تو جنازہ سے پیچھے چلیں، لیکن اگر کسی وجہ سے آگے چلے جائیں تو کوئی حرج نہیں، آگے چلنا بھی جائز ہے، مساجد کی طرف چلنے میں جلدی کرنا چاہیئے مساجد کو آباد کرنے والے اللہ کے محبوب بندے ہوتے ہیں، بلکہ اندھیری راتوں میں مساجد کی طرف چلنے والوں کی بہت فضیلت آئی ہے، جو شخص مسجد سے دور ہو گا اور جتنا چل کر آئے گا اسی نسبت سے ہر قدم پر نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور اتنا ہی زیادہ ثواب حاصل کرے گا

اگر مسجد میں جماعت ہو رہی ہے تو دوڑ کر مسجد میں نہیں چلنا چاہئے، البتہ وقار کے ساتھ تیز چل کر جا سکتے ہیں، مسجد اللہ کا گھر ہے، جو صرف عبادت کے لئے بنائی جاتی ہے، اس کا ادب و احترام ضروری ہے، مسجد میں دوڑنا بے ادبی ہے، اس سے احتراز لازم ہے، رکعت اگرچہ فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو پھر بھی دوڑ کر چلنا مناسب نہیں اور نہ ہی مسجد کو گزرگاہ بنانا چاہیئے- اگر کسی مہمان کے آمد کی اطلاع ہو تو اس کے استقبال کے لئے جانا چاہیئے، اس سے مہمان کی عزت و احترام اور اعزاز کا اظہار ہوتا ہے، اسی طرح اگر مہمان کو رخصت کرنا ہو تو اس کے ساتھ کچھ دور چلنا چاہیئے، تاکہ اس سے محبت، لگاؤ اور تعلق ظاہر ہو، اور مہمان کو اپنے لئے زحمت کا باعث نہ سمجھے

---

(۱) زاد المعاد، ۱/۱۶۹-

اگر عورتوں کے ساتھ چلنے کا اتفاق ہو تو ان کے درمیان ہو کر نہ چلے، بلکہ الگ کچھ فاصلہ سے ہٹ کر چلے، تاکہ شیطان کو فتنے میں ڈالنے کا موقع نہ ملے اور اس کے وسوسے سے بچا جا سکے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آدمی کو عورتوں کے درمیان چلنے سے منع فرمایا ہے[1]، چلتے ہوئے جس طرح راستہ کا حق ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہے کہ چلنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے اسی طرح راستے کا یہ بھی حق ہے کہ اگر بیٹھے ہوں تو چلنے والے کے سلام کا جواب دیں، حدیث میں آیا ہے کہ راستے پر بیٹھے ہوئے کا یہ حق ہے کہ وہ سلام کا جواب دیں[2]۔

اسی طرح اگر کسی شخص نے ایسی جگہ چلنے کی جو خطرناک ہو، یا اتنی دور پیدل چلنے کی قسم کھالی جہاں پر آسانی سے نہیں چل سکتا، یا اتنی دور بغیر مشقت اٹھائے اور تکلیف برداشت کئے جانا دشوار ہے، گویا کہ ایسے سفر کے لئے اپنے آپ کو مشقت میں ڈالنا اور پریشانی و تکلیف میں مبتلا کرنا اور جان کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، تو چاہیئے کہ آسانی اور سہولت کو اختیار کرے مشقت اور تکلیف نہ اٹھائے اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالے، جس قدر طاقت رکھتا ہے سہولت اور آسانی سے کام لے کر چلے[3]۔ ایسی قسم کا پورا کرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ ایسی قسم کو پورا نہ کرنا ضروری ہے، جب اللہ تعالے نے ہر چیز میں آسانی پیدا کردی ہے اور فرمادیا ہے کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو تو ایسی چیزوں سے بچنا ضروری ہے، جس میں ہلاکت اور مشقت میں پڑنے کا اندیشہ ہو، بلکہ آسانی کو اختیار کرتے ہوئے قسم کو توڑ دے، سہولت سے کام لے، ایسی قسم کا کفارہ بھی واجب نہیں ہے، البتہ اگر دیدے تو بہتر ہے۔

اگر چلتے پھرتے اللہ تعالے کا ذکر کرتے رہیں تو یہ بھی عبادت میں شمار ہوگا، چلتے وقت اللہ کا ذکر کرنا مومن بندے کی علامت اور پہچان ہے، اس لئے جہاں بھی جائیں چلتے پھرتے اللہ کا ذکر کرتے رہیں، کیونکہ اگر اپنے ذہن کو مشغول نہیں رکھیں گے تو فاسد افکار کو آنے کا موقع ملے گا اور ذہن پراگندہ رہے گا، اگر ذکر میں لگے رہے تو دل کو سکون اور اطمینان نصیب ہوگا

(باقی ص۲۰ پر)

(۱) ابوداؤد عن ابن عمرؓ (۲) مسلم ۲/۲۱۳۔

(۳) ترمذی ۱/۲۸۰، باب فیمن حلف بالمشی ولا یستطیع۔

ضیافت ۔۔ اسوۂ ابراہیمیؑ اور تعلیماتِ نبویؐ

سماجی اور تمدنی تعلقات میں مہمان نوازی اور ضیافت کی بڑی اہمیت ہے۔ اسلام سے پہلے دیگر مذاہب کے اخلاقی نظام میں مہمان نوازی کا خصوصی طور پر تذکرہ تو نہیں ملتا' تاہم اہل عرب کے یہاں اس کا خاص اہتمام رہا ہے' عربوں کی قومی خصوصیات' امتیازات اور شعائر میں اس کا شمار ہوتا ہے' مہمان نوازی کو وہ اپنا حق سمجھتے تھے اور مہمان کی عزت و آبرو کی پوری حفاظت کرتے تھے۔ قدیم عربی شاعری کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مہمان کی خاطر تواضع اور اس کے ساتھ عزت و تکریم کو عرب، سماجی اور اخلاقی قدروں کا ایک حصہ تصور کرتے تھے۔

اسلام نے عربوں کے اس کریمانہ اور فیاضانہ شعار کو نہ صرف باقی رکھا' بلکہ مختلف انداز سے اس کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے' خود رسول اللہ ﷺ بڑے مہمان نواز' فیاض اور کریم الطبع تھے۔ آپ ﷺ نے غیر مسلم مہمانوں کی ضیافت بھی پورے اہتمام سے فرمائی ہے، اور مکام اخلاق میں مہمان نوازی کو وہ اہمیت دی کہ اسے "ایمان کامل" کا جزو قرار دیا' آپ ﷺ کا ارشاد ہے' جو لوگ خدا اور یوم آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ انھیں اپنے مہمان کی خاطر تواضع کرنی چاہئے (بخاری، مسلم) حدیث میں اکرام ضیف کی جو تعلیم دی گئی ہے، وہ اپنے وسیع مفہوم و معنی میں ہے' مہمان کا احترام اور اکرام' راحت اور سکون بہم پہنچانا' خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آنا' کشادہ قلبی اور فراخ دلی کے ساتھ کھانے پینے کا انتظام اور استراحت و آرام کا اہتمام کرنا' انفرادی یا اجتماعی ملاقات میں دوسروں کے سامنے مہمان کا اونچے الفاظ میں تعارف کرانا۔ یہ سب "اکرام ضیف" میں شامل ہیں۔ امام اوزاعیؒ سے کسی نے پوچھا کہ مہمان کا اکرام کیا ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا! خندہ روئی اور خوش

کلامی۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ضیافت اور ان کے پاس آنے والے مہمانوں کا ذکر سورہ ہود اور سورہ حجر کے علاوہ سورۃ ذاریات میں آیا ہے، سورہ ذاریات میں ہے

هل اتاك حديث ضيف ابراهيم المكرمين، اذ دخلوا عليه فقالوا سلاما' قال سلام قوم منكرون' فراغ الى اهله فجاء بعجل سمين، فقربه اليهم قال الاتاكلون ' فأوجس منهم خيفة قالوا لاتخف و بشروه بغلام عليم

(سورة الذاريات۔ ۲۴۔ ۲۸)

ے پیغمبر! ابراہیم کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تم تک پہنچی ہے کہ جب یہ لوگ ان کے پاس آئے، تو آتے ہی سلام علیک کی' ابراہیم نے سلام کا جواب دیا اور کہا کہ یہ لوگ تو کچھ اجنبی سے معلوم ہوتے ہیں' پھر جلدی سے اپنے گھر جاکر ایک موٹا تازہ بچھڑا (یعنی اس کا گوشت بھنوا کر مہمانوں کے لئے) لائے اور ان کے سامنے رکھا' تو انھوں نے تامل کیا۔ ابراہیم نے پوچھا آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں (اس پر بھی انھوں نے کھانے سے انکار کیا' تب تو ابراہیم ان سے جی ہی میں ڈرے' انھوں نے (ان کی یہ حالت دیکھ کر) کہا کہ آپ کسی طرح کا اندیشہ نہ کریں اور ان کو ایک ہوشیار فرزند کی خوش خبری دی۔

مفسرین نے اس واقعہ کی روشنی میں مہمان نوازی سے متعلق بعض آداب کا ذکر کیا ہے' علامہ زبیدی نے "اتحاف" میں اور علامہ سید سلیمان ندویؒ نے "سیرت النبی" میں اس باب کی بعض اہم تعلیمات اور آداب کا احاطہ کیا ہے' سید صاحب فرماتے ہیں:

اس احکایت سے آداب مہمان نوازی کے متعلق حسب ذیل نتیجے نکالے جاسکتے ہیں (۱) مہمان اور میزبان میں کلام کی ابتداء باہمی سلام سے ہونا چاہئے (۲) مہمان کے کھانے پینے کا فوراسامان کرنا چاہئے' کیوں کہ "روغان" کے معنی سرعت کے ہیں (۳) روغان کے ایک معنی چپکے چلے جانے یا دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے کے بھی ہیں' اس لئے مہمانوں کے کھانے پینے کا سامان مخفی طور پر ان کی نگاہ سے بچا کر کرنا چاہئے' کیوں کہ اگر مہمانوں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے لئے کچھ سامان کیا جارہا ہے' تو وہ ازراہ تکلف اس کو روکیں

گے اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اہل و عیال سے یہ نہیں کہا کہ کھانے پینے کا سامان کرو، بلکہ چپکے سے خود کھانے پینے کا سامان کرنے چلے گئے (۴) کسی بہانے تھوڑی دیر کے لئے مہمانوں سے الگ ہو جانا چاہئے ' تاکہ ان کو آرام کرنے یا دوسری ضروریات سے فارغ ہونے میں تکلیف نہ ہو ' اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کھانے پینے کا سامان کرنے کے لئے ان سے الگ ہو گئے (۵) مہمانوں کے سامنے عمدہ سے عمدہ کھانا پیش کرنا چاہئے، اسی لئے حضرت ابراہیمؑ نے ایک موٹا تازہ بچھڑا ذبح کیا (۶) کھانا مہمانوں کے سامنے پیش کرنا چاہئے، ان کو کھانے کا حکم نہیں دینا چاہئے' اسی لئے حضرت ابراہیم نے ان سے کہا کہ آپ لوگ کیوں نہیں کھاتے ' یہ نہیں کہا کہ آپ لوگ کھایئے (۷) مہمانوں کے کھانے سے مسرور اور نہ کھانے سے مغموم ہونا چاہئے 'کیوں کہ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں ' وہ کھانا تو مہمانوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں ' لیکن ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ مہمان نہ کھائے تاکہ وہ کھانا ان کے اور ان کے اہل و عیال کے کام آئے ' اسی لئے جب ان لوگوں نے کھانے سے انکار کیا تو حضرت ابراہیم نے اس کو ناپسند کیا ' اور ان کے دل میں خطرہ پیدا ہوا کہ یہ دشمن بن کر تو نہیں آئے ہیں (۸) نہ کھانے کی حالت میں مہمانوں کو عمدہ الفاظ میں عذر کرنا چاہئے، اسی لئے ان فرشتوں نے کہا کہ اگر ہم نہیں کھاتے تو آپ کو خوف زدہ نہیں ہونا چاہئے، کیوں کہ ہم لوگ کھاپی نہیں سکتے۔ بلکہ صرف آپ کو ایک لائق فرزند کے تولد کی بشارت دینے کے لئے آئے ہیں،

اسی طرح "سورہ حجر" میں حضرت لوط علیہ السلام کے مہمان فرشتوں کا جو قصہ مذکور ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آرام و آسائش کے ساتھ میزبان ' مہمان کی عزت و آبرو کا بھی محافظ ہوتا ہے ' اس لئے اگر کوئی شخص اس کے ساتھ اہانت آمیز برتاؤ کرنا چاہئے تو میزبان کا یہ فرض ہے کہ مہمان کی جانب سے مدافعت کرے ' کیوں اس سے خود میزبان کی توہین ہوتی ہے ' اسی لئے جب قوم لوط نے ان مہمان فرشتوں کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ کرنا چاہا تو حضرت لوط علیہ السلام نے کہا:

ان ھؤلاء ضیفی فلاتفضحون و اتقو اللہ ولاتجزون (آیت ۶۸۔۶۹) — یہ میرے مہمان ہیں' تو ان کے بارے میں مجھ کو فضیحت نہ کرو اور خدا سے ڈرو اور مجھ کو رسوانہ کرو'

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت ابراہیم ہی نے سب سے پہلے مہمان نوازی کا فریضہ ادا کیا (قرطبی ۹/ ۴۳) وہ بڑے مہمان نواز تھے، اسی لئے ان کی کنیت "ابوالضیفان" تھی (اتحاف ۵/ ۶۲۸) محمد بن عبدالکریم السمر قندی نے اپنی کتاب "روح المجالس" میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جب کھانے کا ارادہ فرماتے اور قریب میں اس وقت کوئی مہمان نہ ہوتا تو کسی مہمان کی تلاش میں میل دو میل کی مسافت طئے کرتے' پھر مہمان کے ساتھ کھانا تناول فرماتے (اتحاف ۵/ ۶۲۷)

ضیافت کے سلسلہ میں بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ میزبان پر واجب ہے اور اکثر علماء کی رائے حدیث و سنت کی روشنی میں عدم وجوب کی ہے' تاہم بعض صورتوں میں میزبانی کو واجب قرار دیا گیا ہے (ترمذی ۲/ ۱۸) ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ ضیافت درحقیقت فرض کفایہ ہے، اور بعض اھلِ علم کی رائے یہ ہے کہ ایسے مقامات پر جہاں خورد و نوش اور سکونت و رہائش کا نظم نہ ہو' وہاں میزبانی واجب ہے (قرطبی ۹/ ۴۴) اس موقع پر یہ بات ذہن میں رہے کہ ضیافت کو مکارمِ اخلاق کا ایک حصہ قرار دیا گیا ہے' یہ انبیاء اور سلف صالحین کی سنت ہے' پھر مہمان کی آمد گھر میں خیر و برکت اور رحمت و سعادت کا باعث ہے' وہ خود نہیں آیا ہے' بلکہ بھیجا گیا ہے، اپنا رزق وہ اپنے ساتھ لاتا ہے' دسترخوان پر آپ کا نہیں بلکہ اپنی قسمت کا کھاتا ہے اور آپ کے اعزاز و اکرام میں اضافہ کا سبب بنتا ہے' تو پھر مہمان کے اعزاز و اکرام کو اپنی سعادت سمجھنا چاہیئے۔

ضیافت سے متعلق بعض قرآنی اشارات کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض نبوی ارشادات ذکر کردئے جائیں، تاکہ "اسوۂ ابراہیمی" کے ساتھ "اسوۂ محمدی" پر بھی نظر رہے،

نبی کریم ﷺ نے مہمان کی خاطر داری پر جس انداز سے ابھارا ہے، اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے حضرت ابو شریحؓ فرماتے ہیں "میری ان دو آنکھوں نے دیکھا اور ان دو کانوں

نے سنا جب کہ نبی کریم ﷺ یہ ہدایت دے رہے تھے کہ "جو لوگ خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، انہیں اپنے مہمانوں کی خاطر تواضع کرنی چاہئے" مہمان کے انعام کا موقع پہلا شب و روز ہے"۔ (بخاری و مسلم)

حدیث میں پہلے شب و روز کو "انعام" سے تعبیر کیا گیا ہے، مفہوم یہ ہے کہ جس طرح انعام دینے والا دل کی انتہائی خوشی اور محبت کے گہرے جذبات کے ساتھ انعام دیتے ہوئے فرحت و انبساط محسوس کرتا ہے، یہی کیفیت پہلے روز میزبان کی ہونی چاہئے۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے "تین دنوں مہمان نوازی حق ہے، پہلے دن اہتمام کے ساتھ، اور بعد کے دنوں میں جو بے تکلف میسر آجائے، کھلادیا جائے، اس میں مہمان اور میزبان دونوں کی رعایت ہے، (ترمذی) تین دن کی ضیافت میں مؤمن کو فراخ قلب ہونا چاہئے، کیونکہ یہ اس کا حق ہے، تاہم اگر مہمان تین دن سے زائد مدت کے لئے قیام کرے تو اس کے لئے "صدقہ" ہے، الضیافة ثلاثة أيام، فما بعد ذلك صدقة" (بخاری و مسلم)

آنحضرت ﷺ کے پاس جب معزز مہمان آتے تو آپ ﷺ خود بنفس نفیس ان کی خاطر داری فرماتے، شاہ حبش نجاشی کے پاس سے کچھ لوگ آپ ﷺ کی خدمت میں آئے تو آپ ﷺ خود ان کی خاطر داری فرما رہے تھے۔، صحابہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ! ہم لوگ خدمت کے لئے حاضر ہیں، تو آپ نے فرمایا "نہیں یہ میرے معزز مہمان ہیں اور میں خود ان کی خدمت کرنا چاہتا ہوں" (اتحاف عن ابی قتادة ۵/۶۴۶)

ایک مرتبہ نبی ﷺ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور بولا حضورؐ! میں بھوک سے بیتاب ہوں، آپ ﷺ نے اپنی کسی بیوی کے یہاں کہلایا کہ، کھانے کے لئے جو کچھ موجود ہو، بھیج دو، جواب آیا اس خدا کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، یہاں تو پانی کے سوا اور کچھ نہیں، پھر آپ ﷺ نے دوسری بیوی کے یہاں کہلا بھیجا، وہاں سے بھی یہی جواب آیا۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے ایک ایک کر کے سب بیویوں کے یہاں کہلوایا اور سب کے یہاں سے اسی طرح کا جواب آیا۔ اب آپ ﷺ اپنے صحابہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا، آج رات کے لئے اس مہمان کو کون قبول کرتا ہے، ایک انصاری صحابیؓ

نے کہا: یارسول اللہ میں قبول کرتا ہوں۔

انصاری مہمان کو اپنے گھر لے گئے، اور گھر جاکر بیوی کو بتایا "میرے ساتھ یہ رسول اللہ کے مہمان ہیں، ان کی خاطر داری کرو، بیوی نے کہا "میرے پاس تو صرف بچوں کے لائق کھانا ہے، صحابی نے کہا "بچوں کو کسی طرح بہلا پھسلا کر سلادو، اور جب مہمان کے سامنے کھانا رکھو تو کسی بہانے سے چراغ بجھادینا اور کھانے پر مہمان کے ساتھ بیٹھ جانا، تاکہ اس کو یہ محسوس ہو کہ ہم بھی کھانے میں شریک ہیں، اس طرح مہمان نے تو پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور گھر والوں نے ساری رات، فاقے سے گذاری، صبح جب یہ صحابی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے دیکھتے ہی فرمایا: تم دونوں نے رات اپنے مہمان کے ساتھ جو حسنِ سلوک کیا وہ خدا کو بہت ہی پسند آیا"۔

(بخاری کتاب التفسیر، مسلم باب اکرام الضیف)

مہمان اگر کسی موقع سے ہمارے ساتھ بے مروتی اور بے رخی سے پیش آئے تو اس کے ساتھ بھی اعلیٰ ظرفی اور فیاضی کا معاملہ کرنا چاہئے، یہی مومنانہ شان ہے، حضرت ابوالاحوص جشمیؓ اپنے والد کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ ایک بار انہوں نے نبی ﷺ سے پوچھا "اگر کسی کے پاس میرا گذر ہو اور وہ میری ضیافت اور مہمانی کا حق ادا نہ کرے، اور پھر کچھ دنوں کے بعد اس کا گذر میرے پاس ہو تو کیا میں اس کی مہمانی کا حق ادا کردوں، یا اس کی بے مروتی کا بدلہ اسے چکھاؤں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، نہیں، بلکہ تم ہر حال میں اس کی مہمانی کا حق ادا کرو"۔ (مشکوۃ)

مہمان جب واپس ہونے لگے تو "اکرام ضیف" اور سنت کا تقاضہ یہ ہے کہ مہمان کو گھر کے دروازے تک پہنچائے، إن من السنة أن تشيع الضيف الى باب الدار"۔ (بیہقی۔ بحوالہ اتحاف ۵/ ۲۶۴)

مہمان کے لئے مستحب ہے کہ میزبان جہاں بیٹھنے کا انتظام کرے وہیں بیٹھے، اٹھنے بیٹھنے میں تواضع سے کام لے، ایسی جگہ نہ بیٹھے، جہاں بے پردگی ہونے کا امکان ہو، اور جب جانے لگے تو صاحب خانہ کی اجازت سے واپس جائے۔

مہمان کو جب اپنے گھر ٹہرائیں تو بیت الخلاء، وضو خانہ، حمام، قبلہ کا رخ اور نماز کی جگہ بتادی جائے، امام شافعیؒ، امام مالکؒ کے یہاں مہمان ہوئے تو ان سے امام مالکؒ کے خادم نے کہا، حضرت قبلہ کا رخ یہ ہے، پانی کا برتن یہاں رکھا ہے، بیت الخلاء اس طرف ہے، (اتحاف ۵/ ۲۴۳)

آدمی جب کہیں مہمان ہوتا ہے تو میزبان کے لئے بہر حال ایک گونہ تکلیف کا باعث ہوتا ہے، بسا اوقات میزبان کے معمولات میں فرق آجاتا ہے، پھر ایک غیور شخص کے لئے یہ مناسب بھی نہیں کہ وہ بے وجہ کسی کے یہاں مہمان بنا رہے، اس لئے جہاں میزبان کو مہمان کی خاطر تواضع کا حکم دیا گیا ہے، وہیں مہمان کو بھی بتادیا گیا ہے کہ کسی کے خوانِ کرم سے حد سے زیادہ فائدہ اٹھانا انسانی غیرت اور اخلاق کے تقاضہ کے خلاف ہے۔ حدیث میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ تین دن سے زیادہ مہمان نہ رہے، اس لئے کہ اس سے صاحبِ خانہ کو تکلیف ہوگی، ایک اور حدیث میں ہے کہ "مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کے یہاں اتنا ٹھیرے کہ اس کو گناہگار کردے، لوگوں نے کہا "اے اللہ کے رسول! گناہگار کیسے کریگا؟ فرمایا "اس طرح کہ وہ اس کے پاس اتنا ٹھیرے کہ میزبان کے پاس ضیافت کے لئے کچھ نہ رہے" (مسلم) تاہم اگر صاحبِ خانہ خلوصِ دل سے مزید قیام کے لئے اصرار کرے تو ٹہرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مہمان کو چاہئے کہ میزبان کے لئے کشادہ روزی، خیر و برکت اور رحمت و برکت کی دعا کرتا ہوا رخصت ہوئے، رسول اللہ ﷺ سے یہ دعاء منقول ہے:

اللهم بارك لهم فی ما رزقتهم واغفر لهم وارحمهم (مسلم عن عبد البر بن بسر)	خدایا! ان کے رزق میں برکت دے، ان کو معاف فرما اور رحم فرما۔

اور اگر آپ ﷺ کسی شخص کے یہاں روزہ افطار فرماتے تو یہ دعاء پڑھتے۔

افطر عندکم الصائمون واکل طعامکم الابرار وصلت علیکم الملائکة (ابو داؤد عن انس)	تمہارے پاس روزہ داروں نے افطار کیا، نیکو کار تمہارا کھانا کھائیں اور فرشتے دعاء رحمت کریں۔

مرابحہ
غیر سودی بینک کاری کی اہم بنیاد

مولانا سید حسنین احمد ندوی

عالمی معیشت پر یہود کی اجارہ داری نے سود کو نہ صرف زندگی کے ہر شعبہ میں داخل کر دیا ہے بلکہ اقتصادی سرگرمیوں کی ترتیب وتنظیم اس طرح کی ہے کہ وہ لوگوں کے لئے ایک ناگزیر ضرورت بن گیا ہے، بینک، انشورنس، اسٹاک اکسچینج وغیرہ ایسے ادارے ہیں جنہیں ملک وقوم کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے، اس کے بغیر اقتصادی سرگرمیوں کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ سب صرف سود سے آلودہ ہیں، بلکہ ان کا خمیر ہی سود سے اٹھا ہے۔ آپ مشرق میں ہوں یا مغرب میں، کسی ایسے ملک میں ہوں جہاں الحاد، لادینی اور مادیت کا دور دورہ ہو، یا ایسی جگہ جہاں اسلام، کتاب وسنت اور شریعتِ محمدی جیسے الفاظ کی گونج سنائی دیتی ہو، سود سے اپنا دامن نہیں بچا سکتے۔

اسلام میں سود کی حرمت پر جو سخت ترین وعیدیں آئی ہیں اس نے بہت سے لوگوں کو اس کا بدل تلاش کرنے پر مجبور کیا، اس کے لئے مختلف جگہوں پر اجتماعی اور انفرادی کوششیں بھی ہوئیں، لیکن معاملہ امکانی جائزوں، تجویزوں اور قراردادوں کی بھول بھلیوں میں گم ہوتا رہا، جس کی بڑی وجہ اس پروپگنڈے کا اثر تھا کہ غیر سودی بینکوں کا قیام سودی بینکوں کی موجودگی میں ناممکن ہے پھر بھی اللہ کے کچھ نیک بندوں نے اپنی جد وجہد جاری رکھی اور بالآخر ۱۹۶۲ئ میں جرمنی کے تعاون سے مصر کے شہر میت غمر میں پہلے غیر سودی بینک کے قیام میں انہیں کامیابی حاصل ہوئی، اس کامیاب تجربہ کی بنیاد پر ۱۹۷۵ئ میں "دبئی اسلامی بینک" کا قیام عمل میں آیا جس کی اعلیٰ خدمات، صاف ستھرا نظام اور خدمتِ خلق کے جذبہ کی وجہ سے بہت جلد اس نے بینکوں کی دنیا میں اپنا الگ مقام بنا لیا، اس کی افادیت اور کامیابی کو دیکھتے ہوئے دیگر مقامات پر بھی اس طرح کے بینک قائم کئے گئے۔ چنانچہ اب تک دنیا کے مختلف ممالک میں ستر سے زیادہ ایسے بینک قائم ہو چکے ہیں جو غیر سودی بنیادوں پر کامیابی کے ساتھ

اقتصادی سرگرمیوں میں اپنا رول ادا کر رہے ہیں۔

ان بینکوں نے سرمایہ کاری کے فروغ اور دیگر اقتصادی سرگرمیوں کی انجام دہی کے لئے جن شرعی بنیادوں پر اپنا نظام استوار کیا ہے اس میں "مرابحہ" کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ "مرابحہ" بیع کی ایک قسم ہے، فقہاء نے اس کی حسب ذیل تعریفیں کی ہیں:

نقل ماملکه بالعقد الاوّل بالثمن الاول۔ (شرح فتح القدیر ۶/۱۲۲)	یہ کسی چیز کو اس کی قیمت خرید پر منافع کے اضافہ کے ساتھ فروخت کرنا ہے۔
المرابحه بمثل الثمن الاول وزيادة ربح۔ (عالمگیری ۳/۱۶۰)	مرابحہ نام ہے کسی چیز کی پہلی قیمت پر منافع کی زیادتی کا۔
المرابحه مصدر ربح وشرعا بيع ماملكه بما قام عليه وبفضل (رد المحتار علی الدر المختار ۴/۱۵۲)	مرابحہ رابح کا ماخذ ہے، شریعت میں اس سے مراد کسی چیز کو اس کی اصل لاگت پر منافع کے اضافہ کے ساتھ فروخت کرنا ہے۔
انه بيع بمثل الثمن الاوّل مع زيادة الربح۔ (بدائع الصنائع ۵/۲۲۰)	مرابحہ ایسی بیع ہے، جس میں کسی چیز کو اس کی پہلی قیمت پر نفع کے اضافہ کے ساتھ فروخت کیا جائے۔

قرآن پاک سے ثبوت:

وآخرون يضربون فى الارض ويبتغون من فضل الله۔ (المزمل - ۲۰)

ليس عليكم جناح ان تبتغوا فضلا من ربكم۔ (البقرہ - ۱۹۸)

الا ان تكون تجارة عن تراض منكم۔ (النساء - ۲۹)

مرابحہ اللہ کا فضل ہے، جو انسان کو اس کی کوششوں اور جدوجہد کے نتیجہ میں حاصل ہوتا ہے، اس کے علاوہ آیت میں لفظ بیع عام ہے، جو بیع کی ان تمام صورتوں پر صادق آتی ہے، جسے شریعت نے ممنوع قرار دیا ہو۔

حدیث سے ثبوت :

اذا اختلف الجنسان فبیعوا کیف شئتم ۔ (صحیح مسلم، مع شرح النووی ۲/ ۹۸)

جب اجناس مختلف ہوں تو پھر جیسے چاہو بیچو ۔

" مرابحہ" میں بھی مختلف اجناس کی تبدیلی ہوتی ہے ، اس لئے یہ جائز ہوگا ۔

علامہ ابن ہمام نے شرح ہدایہ میں" مرابحہ اور تولیہ" کے ضمن میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ اس کے جواز کے لئے الگ سے کسی دلیل کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ یہ بیع کی ایک قسم ہے اور بیع کا جواز قطعی دلائل سے ثابت ہے ۔

ولا یخفی انہ لا یحتاج الی دلیل خاص لجوازھا ، بعد الدلیل المثبت لجواز البیع مطلقا بما تراضیا علیہ بعد ان لا یخل بما علم شرطا للصحۃ ھو دلیل جوازھا ۔ (شرح فتح القدیر ۶/ ۱۲۳)

مرابحہ کے جواز کے لئے الگ سے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے ، اس لئے کہ مطلقاً بیع کا جواز ثابت ہے ، جو فریقین کی رضامندی سے ہو اور اس میں وہ تمام شرائط موجود ہوں جو بیع کے صحیح ہونے کے لئے ضروری ہیں ؛ لہٰذا مطلقاً بیع کے جواز کی دلیل مرابحہ کے جواز کی دلیل ہوگی ۔

" مرابحہ کا رواج عربوں میں قدیم زمانہ سے موجود تھا ، اسلام نے بھی اسے تمام لوگوں کی افادیت کے تحت باقی رکھا ، اس لئے کہ بہت سے لوگ خرید و فروخت کا تجربہ نہیں رکھتے اور نہ ہی وہ تجارتی اور کاروباری دنیا کے نشیب و فراز سے واقف ہوتے ہیں ، چنانچہ اپنی سادگی اور ناواقفیت کی وجہ سے چیزیں غیر معمولی طور پر گراں خرید لیتے ہیں اور نقصان اٹھاتے ہیں ۔

" مرابحہ" ایسے لوگوں کو نقصان سے بچانے کا اہم ذریعہ ہے ، اس طرح کہ یہ لوگ خود خریدنے کے بجائے ان لوگوں کے ذریعہ خریداری کرتے ہیں جنہیں خرید و فروخت کا تجربہ ہوتا ہے اور وہ مارکٹ کے اتار چڑھاؤ سے بھی واقفیت رکھتے ہیں ، اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص پہلے سامان خریدتا ہے اور پھر اس پر اپنا منافع رکھ کر دوسرے قسم کے لوگوں کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے ، اس سے جہاں ایک شخص کو منافع کی شکل میں فائدہ ہوتا ہے ، وہیں دوسرا شخص ، اس نقصان سے بچ جاتا ہے جو اسے ناواقفیت کی وجہ سے براہِ راست خریداری کی صورت میں ہو سکتا تھا ؛ اس حقیقت کی جانب صاحبِ ہدایہ نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے ۔

والحاجة ماسة الیٰ هذا النوع من البیع لان الغبی الذی لا یهتدی من التجارة یحتاج الی ان یعتمد فعل الذکی المهتدی. (شرح فتح القدیر ۶/۲۳)	بیع کی یہ صورت ایک ناگزیر ضرورت ہے، اس لئے کہ بہت سے سادہ لوح لوگ جو کاروباری شعور نابلد ہوتے ہیں، انہیں اس بات کی ضرورت پڑتی ہے کہ وہ اس کے لئے کسی ماہر اور تجربہ کار شخص کی خدمات حاصل کریں۔

مرابحہ کا بنیادی مقصد ہی چونکہ عام سادہ لوح لوگوں کو راست خریداری کے نتیجہ میں ہونے والے خسارہ سے بچانا ہے اس لئے امانت ودیانت کو مرابحہ کے معاملہ میں غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے اور ایسی تمام صورتوں کو ممنوع قرار دیا گیا ہے، جن کی وجہ سے مرابحہ کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو جاتا ہو اور یہ عام لوگوں کے لئے فائدہ کے بجائے نقصان کا ذریعہ بن جائے، اس کی بنیادی طور پر دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ وہ شخص جس پر مرابحہ کے سلسلے میں اعتماد کیا گیا ہو خیانت سے کام لے اور کسی چیز کی اصل قیمت یا اس پر جو لاگت آئی ہو اس سے زیادہ ظاہر کرے اور پھر اس پر منافع رکھ کر مرابحہ کرے دوسری صورت یہ ہے کہ وہ خود ہی کسی وجہ سے سامان غیر معمولی طور پر گراں خرید لے، یا نقد کے بجائے ادھار خریدے، جو نقد کے مقابلہ میں عموماً زیادہ ہوتا ہے اور جان بوجھ کر اس کا اظہار نہ کرے۔

امانت ودیانت

امانت ودیانت کو شریعت اسلامی میں خاص اہمیت حاصل ہے، اسلام نے تمام معاملات میں سختی کے ساتھ اس کی تاکید کی ہے۔

یا ایہا الذین اٰمنوا لا تخونوا اللہ و الرسول و تخونوا اماناتکم. (الانفال - ۲۷)	اے ایمان والو! نہ تو خدا اور رسول کی امانت میں خیانت کرو اور نہ ہی اپنی امانتوں میں خیانت کرو۔

معاملات کسی بھی نوعیت کے ہوں اس میں امانت داری کا خیال رکھا جانا ضروری ہے، لیکن مرابحہ میں اس کی اہمیت دیگر معاملات کے مقابلہ میں زیادہ ہے، اس لئے کہ خیانت کی وجہ سے نہ صرف مرابحہ کی افادیت مجروح ہوتی ہے، بلکہ وہ بے معنیٰ ہو کر رہ جاتا ہے، اس لئے مرابحہ میں یہ بات ضروری ہوگی کہ سامان کی بالکل صحیح قیمت بیان کی جائے، اگر اس میں کوئی نقص یا عیب ہو تو اسے بھی واضح کردے اور خیانت سے کام نہ لے۔

ولھذا کان مبناھما علی الامانہ والاحتراز عن الخیانہ وعن شبہتہا (شرح فتح القدیر ۶/۱۲۳)

مرابحہ اور تولیہ کی بنیاد امانت پر رکھی گئی ہے، جس کا تقاضا ہے کہ خیانت اور اس کے امکان سے بھی گریز کیا جائے۔

مرابحہ کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ سامان کی اصل قیمت بالکل صحیح بیان کی جائے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اصل قیمت سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلہ میں اور کن چیزوں کو قیمت خرید کے ساتھ شامل کیا جائے گا؟ حنفیہ کے یہاں اسے تمام تر عرف و عادت پر چھوڑ دیا گیا ہے، لہٰذا کاروباری دنیا میں جن چیزوں کو اصل قیمت کے ساتھ شامل کیا جاتا ہے، اسے شامل کیا جائے گا۔

والاصل ان عرف التجار معتبر فی بیع المرابحۃ فمایری العرف بالحاقہ براس المال یلحق بہ ومالا فلا۔ (عالمگیری ۳/۱۶۲)

مرابحہ کے سلسلہ میں تاجروں کے درمیان رائج عرف کا اعتبار کیا جائیگا، کاروباری لوگ جن اخراجات کو کسی چیز کی قیمت میں شامل کرتے ہیں انہیں شامل کیا جائے گا اور جسے وہ نہیں کرتے وہ شامل نہیں کیا جائے گا۔

اصل قیمت کا تعین کرتے ہوئے ان امور کا بھی خیال رکھا جائے گا، جو سامان کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتے ہوں، لہٰذا سامان کی قیمت کے ساتھ ٹرانسپورٹیشن اور آفیشیل اخراجات کے علاوہ ریپیرنگ یا کلرک وغیرہ کے اخراجات بھی شامل کئے جائیں گے۔

البتہ یہ سوال کہ بعض ڈیلر یا اداروں کو ان کے کاروباری تعلقات کی بنیاد پر خصوصی ڈسکاؤنٹ یا کمیشن حاصل ہوتا ہے جس سے سامان کی قیمت بازار کے عام نرخ سے کم ہو جاتی ہے تو مرابحہ کرتے ہوئے کمیشن کے ساتھ اصل قیمت کا ذکر کیا جائے گا اور یہ کمیشن مرابحہ کرنے والے کا سمجھا جائے گا، اس لئے کہ یہ اس کے تعلقات، اثر و رسوخ اور کوششوں کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔

اس بات کا تعین کرتے ہوئے ہمیں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہئے کہ مرابحہ کا اصل مقصد ہی یہ ہے کہ مرابحہ کرنے والے کے تجربات اور اس کے کاروباری تعلقات سے عام خریداروں کو فائدہ پہنچے اور وہ اس کے ذریعہ کم سے کم نرخ پر سامان حاصل کر سکیں، جو ان کے لئے براہِ راست مارکیٹ سے خریداری کی صورت میں ممکن نہ ہو، اس کا تقاضا ہے کہ کمیشن یا ڈسکاؤنٹ کے نام سے قیمت میں جو تخفیف ہوتی ہے، اس تخفیف شدہ قیمت کا ہی ذکر مرابحہ کرتے ہوئے کیا جائے، صاحب مبسوط کی اس صراحت سے بھی اس کا اشارہ ملتا ہے:

اذا باع المتاع مرابحة ثم حط البائع الاول منه شيا من الثمن الاول فانه يحط ذلك من المشتری الآخر د حصته من الثمن۔ (المبسوط، ۱۳/۸۴)

کسی چیز کو کوئی مرابحہ کی بنیاد پر فروخت کردے اور پھر مرابحہ کرنے والے نے جس سے خریدا تھا وہ قیمت میں تخفیف کردے تو مرابحہ کی بنیاد پر جسے سامان فروخت کیا گیا ہے اس کی قیمت میں کمی کی جائے گی اور اسی تناسب سے منافع میں۔

"مرابحہ کرتے ہوئے اصل قیمت کا ذکر کیا جانا ضروری ہے، اس سلسلہ میں ایک اور بات جو اہم ہے، وہ یہ کہ اگر مرابحہ کرنے والے نے کوئی چیز ادھار خریدی ہو تو اس کی بھی صراحت کردے اس لئے کہ ادھار قیمت عموماً نقد کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی ہے اور مرابحہ کئے جانے کی صورت میں اس بات کا قوی امکان ہوتا ہے کہ خریدار کو اس سے وہ فائدہ حاصل نہ ہو جس کی نقد کی صورت میں مرابحہ پر خریداری کے ذریعہ توقع کی جا سکتی ہے۔

لامساواة بين النقد والنسيئة لان العين خير من الدين والمعجل اكثر قيمة من المؤجل۔ (بدائع والصنائع ۵/۱۸۷)

نقد اور ادھار برابر نہیں ہو سکتے، اس لئے کہ عین دین ہے اور نقد ادھار سے زیادہ قدر و قیمت کا حامل ہوتا ہے۔

لواشتری نسيئة لم يبعه مرابحه حتی يبين۔ (عالمگیری ۳/۱۶۲)

اگر ادھار کچھ خریدا ہے تو اس کی وضاحت کئے بغیر اسے مرابحہ پر فروخت نہیں کرے گا۔

الانسان فی العامة يشتری الشی بالنسيئة باكثر مما يشتری بالنقد۔ (المبسوط ۱۳/۷۸)

لوگ اکثر نقد کے مقابلہ میں ادھار زیادہ قیمت دے کر خریدتے ہیں۔

اسی طرح مرابحہ کرنے والے کے لئے یہ بات بھی ضروری ہوگی کہ اگر اس نے کوئی چیز کسی وجہ سے غیر معمولی طور پر گراں خرید لی ہے اور اسے اس کا اندازہ ہے تو اس کی وضاحت کردے اس لئے کہ اس سے مرابحہ کی افادیت مجروح ہوتی ہے۔

واذا اشتری شيئاً باكثر من ثمنه مما لا يتغابن الناس فی مثله وهو يعلم ذلك فليس له ان يبيعه مرابحه من غير بيان۔ (المبسوط ۱۳/۸۶)

اگر کسی نے سامان اتنا گراں خرید لیا، جو عموماً لوگ نہیں خریدتے اور اسے اس بات کا اندازہ ہے تو مرابحہ کی بنیاد پر اسے بغیر وضاحت کے فروخت نہیں کرے گا۔

... ...

خیانت کے اثرات

مرابحہ کے معاملہ میں خیانت کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، اصل قیمت کی مقدار میں خیانت ہو یا اس کی صفت میں۔

اصل قیمت کی مقدار میں خیانت کا مطلب یہ ہے کہ مرابحہ کرنے والا قیمت میں کسی ایسی چیز کو شامل کر دے جو تجارتی عرف وعادت کے خلاف ہو، یا سامان کا کچھ حصہ رکھ لے یا بدل دے، یا اس نے سامان غیر معمولی طور پر گراں خریدا ہو اور اس کا ذکر نہ کرے۔

اصل قیمت کی صفت میں خیانت سے مراد یہ ہے کہ قیمت کے اوصاف میں سے کچھ چھپا لے، جیسے سامان ادھار خریدا ہو، لیکن اس کا اظہار نہ کرے، یا اس عیب کی وضاحت نہ کرے جو اس کی وجہ سے، یا کسی اور کی وجہ سے سامان میں پیدا ہوا ہو۔

مرابحہ میں خیانت کی صورت میں خریدار کو اس بات کا اختیار دیا جائے گا کہ وہ مطلوبہ قیمت ادا کر کے سامان لے لے، یا اگر چاہے تو سامان لوٹا دے، اس لئے کہ خیانت کی وجہ سے مرابحہ کی افادیت مجروح ہوتی ہے، لہٰذا خریدار کو اس بات کا حق حاصل ہوگا کہ وہ چاہے تو اس معاملہ کو ختم کر دے اور سامان لوٹا دے، لیکن خیانت سے واقفیت کے باوجود اگر کوئی شخص سامان لینے پر رضامند ہو تو وہ پوری قیمت دے کر سامان لے سکتا ہے۔

وان خان فی المرابحة فهو بالخيار ان شاء اخذ بكل الثمن وان شاء ترك. (عالمگیری ۳/۱۶۲)	اگر مرابحہ کرنے والا خیانت سے کام لے تو خریدار کو اختیار ہوگا، اگر چاہے تو مکمل قیمت دے کر لے لے اور اگر چاہے تو چھوڑ دے۔

اختیار کی یہ صورت اس وقت ہے، جب کہ سامان اپنی اصلی حالت میں موجود ہو، لیکن اگر خریدار نے سامان کو استعمال کر لیا، یا وہ اس کے پاس سے ضائع ہو گیا تو امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے قول کے مطابق اسے پوری قیمت کی ادائیگی لازم ہوگی، جب کہ امام یوسفؒ اور دیگر فقہاء کے قول کے مطابق خیانت کی مقدار اور اسی تناسب سے منافع میں کمی کر دی جائے گی۔

واذا باع المتاع مرابحة فخانه فيه فالمشتري	اگر کوئی شخص مرابحہ کی بنیاد پر سامان فروخت کرے،

بالخیار اذا اطلع علیه، ان شاء اخذہ بجمیع الثمن وان شاء ترك وان استهلك المتاع او بعضه فالثمن کله لازم فی قول ابی حنیفة ومحمد وقال ابو یوسف وابن ابی لیلی یحط عن الخیانة وحصتها من الربح علی کل حال ولا خیار له فی ذلك۔

(المبسوط ۱۳/۸۶)

لیکن اس میں خیانت سے کام لے اور خریدار کو اس کا پتہ چل جائے تو اسے اختیار رہے گا، چاہے تو مطلوبہ قیمت ادا کر کے سامان لے لے اور چاہے تو چھوڑ دے، لیکن اگر سامان جزئی یا کلی طور پر ضائع ہو گیا ہو تو امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے قول کے مطابق پوری قیمت ادا کرنی ہوگی، جب کہ امام ابو یوسفؒ اور ابن ابی لیلیٰ کی رائے ہے کہ قیمت میں خیانت کی مقدار کم کر دی جائیگی اور اسی تناسب سے منافع میں کمی کی جائے گی۔

مرابحہ کی شرطیں

مرابحہ کے صحیح ہونے کے لئے عمومی شرطیں وہی ہیں جو بیع کے صحیح ہونے کے لئے ہیں، البتہ اس کی خاص شرطیں حسب ذیل ہیں:

(۱) پہلی بیع صحیح ہو، اس لئے کہ مرابحہ کی بنیاد پہلی بیع پر ہوتی ہے، لہٰذا اگر وہ صحیح نہ ہوگی تو پھر اس کی بنیاد پر مرابحہ کرنا صحیح نہ ہوگا۔

(۲) سامان کی اصل قیمت سے مرابحہ کی بنیاد پر خریدنے والا واقف ہو۔

(۳) اصل قیمت ذواتِ امثال میں سے ہو، یعنی اس کا بدل موجود ہو اور اگر ذواتِ قیم ہو تو اس کی ادائیگی پر قدرت ہو۔

(۴) منافع کی مقدار سے خریدار واقف ہو۔

(۵) سامان کی اصل قیمت کا تعلق ایسی جنس سے نہ ہو جو ربا کے زمرے میں آتی ہیں، اس لئے کہ ایسی صورت میں منافع کا اضافہ صحیح نہ ہوگا۔

مرابحہ اور غیر سودی بینک کاری

مرابحہ کی عام صورت جس کا ذکر فقہ کی کتابوں میں ملتا ہے یہی ہے کہ کسی چیز کو اس کی اصل قیمت پر منافع کے اضافہ کے ساتھ فروخت کر دیا جائے، غیر سودی بنیاد پر منظم کئے گئے اسلامی بینکوں اور

مالی اداروں نے اس کے تطبیق کی جو صورتیں اختیار کی ہیں وہ اس سے کسی قدر مختلف ہے، لیکن اس میں مرابحہ کی بنیادی فکر بہرحال موجود ہے، اس طرح کہ بینک بھی کسی چیز کو خریدنے کے بعد اصل قیمت پر متعین منافع رکھ کر دوسرے کے ہاتھ فروخت کرتا ہے۔

غیر سودی بنیادوں پر قائم کئے جانے والے بینک جو خلیجی ممالک کے علاوہ پاکستان، بنگلہ دیش، سوڈان، ترکی، موریتانیا، مصر، اردن اور لکسمبرگ وغیرہ میں کامیابی کے ساتھ سرگرم عمل ہیں، ان سب نے مرابحہ کو وسیع پیمانہ پر اختیار کیا ہے، اس لئے کہ اس کے ذریعہ جہاں عام لوگوں کو اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے سودی اداروں یا بینکوں کا بدل اس شکل میں مل گیا ہے، وہیں یہ خود بینک کے لئے بھی منافع کمانے کا اچھا ذریعہ ہے۔

ان بینکوں نے سود یا ایسے کاروبار جو غیر اسلامی ہوں، ان سے بچنے کے لئے اپنا شرعی مشیر مقرر کر رکھا ہے، جن سے وہ مالی معاملات کو شریعت اسلامی کے مطابق انجام دینے میں مدد لیتے ہیں، یا پھر وہ اس کے لئے اپنے یہاں قائم نگراں شرعی تنظیم سے رجوع کرتے ہیں جو "هيئة الرقابة الشرعية" کے نام سے جانی جاتی ہے، ان کے مقرر کردہ ضابطوں میں اختلاف کی وجہ سے اس طرح کے بینکوں میں مرابحہ کی رائج صورتوں میں یکسانیت نہیں ہے، پھر بھی مرابحہ کا اصل جوہر ان سبھوں میں قدر مشترک کے طور پر موجود ہے۔

ان بینکوں میں مرابحہ کی جو شکلیں رائج ہیں، تفصیل سے قطع نظر اسے تین مرحلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) خریداری کی درخواست۔

(۲) خریداری کا وعدہ۔

(۳) مرابحہ کی بنیاد پر خریداری۔

پہلے مرحلہ کے تحت کوئی بھی شخص ادارہ یا کمپنی اپنے مطلوبہ سامان اور اس کے تفصیلی اوصاف کی وضاحت کے ساتھ ایک درخواست بینک کو پیش کرتا ہے، جس میں اس بات کی صراحت کی جاتی ہے کہ اگر بینک مذکورہ سامان اس کے لئے خرید لے تو وہ مرابحہ کی بنیاد پر بینک سے اس سامان کو خرید لے گا۔

دوسرے مرحلہ کے تحت بینک مطلوبہ سامان پر لاگت کا تخمینہ، منافع کی مقدار، حوالگی کی صورتیں اور ادائیگی کی مدت وغیرہ پر باہمی رضامندی سے اتفاق کے بعد مذکورہ شخص سے اس بات کا تحریری وعدہ لیتا ہے کہ بینک جب مطلوبہ اوصاف کا حامل سامان حاصل کرے گا تو وہ اس سے مرابحہ کی بنیاد پر سامان خریدے گا۔

تیسرے مرحلہ کے تحت بینک سامان حاصل کرکے مذکورہ شخص کے حوالے کرتا ہے اور وہ شخص سامان پر قبضہ کے بعد مرابحہ کی بنیاد پر طے شدہ شرائط کے مطابق قیمت کی ادائیگی کرتا ہے۔

اسلامی بینکوں نے مرابحہ کے لئے جو صورت اختیار کی ہے، اس نے جہاں بعض نئے مسائل پیدا کئے ہیں، وہیں ان کے بارے میں بعض غلط فہمیاں بھی ہیں، ہم انہیں حسب ذیل عنوانات کے تحت ذکر کریں گے:

(۱) بیع مالا یملك یا بیعتان فی بیعۃ۔

(۲) وعدہ کا لزوم۔

(۳) قیمت کی تاخیر سے، یا قسطوں پر ادائیگی۔

"بیع مالا یملک" یا "بیعتان فی بیعہ"۔

اسلامی بینکوں میں رائج مرابحہ کی مذکورہ صورتوں پر کئے جانے والے شبہات میں سے ایک یہ ہے کہ یہ ایسی چیز کی بیع کے مترادف ہے جو فروخت کرنے والے کے پاس موجود ہی نہ ہو، اس لئے کہ بینک مرابحہ کی بنیاد پر کی جانے والی فروخت کی تفصیلات اس وقت طے کرتا ہے، جب وہ سامان اس کے پاس سرے سے موجود ہی نہیں ہوتا، حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔

لا یحل سلف وبیع ولا شرطان فی بیع ولا ربح مالم یضمن ولا بیع ما لیس عندك۔ (ترمذی)

قرض اور بیع ایک ساتھ جائز نہیں ہے اور نہ ہی بیع میں دہری شرط لگانا جائز ہے، اس طرح نہ ایسا منافع جائز ہے، جس میں ضامن نہ ہو اور نہ ہی ایسی چیز کی بیع جس کا مالک نہ ہو۔

اس طرح اس کے بارے میں بھی اس شبہہ کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ یہ ایک بیع میں دو بیع کے

مماثل ہے، جسے حدیث میں صراحت کے ساتھ ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

من باع بیعتین فی بیعة فله اوکسهما او الربا۔ (ابو داؤد)

جس نے ایک بیع کے تحت دوسری بیع کی تو اسے ختم کر دینا چاہئے، ورنہ ربا ہو جائے گا۔

نهی النبی عن صفقتین فی صفقة۔ (مسند احمد)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بیع کے تحت دوسری بیع سے منع فرمایا ہے۔

مذکورہ شبہات دراصل اس غلط فہمی پر مبنی ہیں کہ مرابحہ کے انعقاد سے پہلے جو دوسرے مرحلے بینکوں میں رائج ہیں اسے بھی بیع سمجھ لیا گیا ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی دونوں کے مرحلے جس میں ایک فریق کسی خاص چیز کی خریداری کے لئے اپنی دلچسپی کا اظہار کرتا ہے اور اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ اگر بینک مذکورہ سامان خرید کر مرابحہ کی بنیاد پر اسے فروخت کرے تو وہ خرید لے گا، یہ سرے سے بیع ہے ہی نہیں، بلکہ اس کی حیثیت مرابحہ کی بنیاد پر خریداری میں دلچسپی کے اظہار اور خریداری کے وعدہ کی ہے، یہی وجہ ہے کہ بینک اپنے نام سے خرید کرتا ہے اور سامان کی دوسرے فریق کو حوالگی تک وہی اس کا مالک اور ذمہ دار ہوتا ہے، لہٰذا اگر سامان دوسرے فریق کے سپرد کئے جانے سے پہلے ضائع ہو جائے یا اس میں عیب لگ جائے تو یہ نقصان تنہا بینک کا ہوتا ہے، دوسرے فریق پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی، لہٰذا بینکوں میں رائج مرابحہ کی مذکورہ صورتوں پر ان احادیث کا اطلاق سرے سے نہیں ہوتا، جن میں ایسی چیز کی بیع سے منع کیا گیا ہے، جس کا آدمی سرے سے مالک ہی نہ ہو، یا دو بیع ایک بیع کے ضمن میں کی جا رہی ہو۔

وعدہ کا لزوم

غیر سودی بینکوں نے مرابحہ کے لئے جو طریقۂ کار اختیار کیا ہے، اس کے تحت دوسرے فریق اور بینک کے درمیان کسی چیز کی خریداری پر اتفاق ہوتے ہی مرابحہ منعقد نہیں ہو جاتا، بلکہ اس سے پہلے کی کاروائیاں کی جاتی ہیں، جس میں سرفہرست اس بات کا وعدہ ہے کہ جب بینک مطلوبہ سامان خرید لے گا تو دوسرا فریق مرابحہ کی بنیاد پر اس سے وہ سامان خرید لے گا، اس طرح کسی متعین سامان کے مرابحہ کی بنیاد پر خریداری کے وعدہ کی بنیاد پر بینک اس سامان کو حاصل

کرتا ہے، بینک کو اس سلسلہ میں اپنا مال اور تجربہ خرچ کرنا پڑتا ہے، تاکہ وہ مطلوبہ سامان کو مناسب قیمت پر خرید سکے، اس کے علاوہ بینک اس بات کا بھی پابند ہوتا ہے کہ وہ مذکورہ سامان کسی تیسرے فرد کے ہاتھ فروخت نہ کرے، اگرچہ اسے زیادہ قیمت مل رہی ہو، لہٰذا دوسرے فریق نے جو سامان خریدنے کا وعدہ کیا ہے وہ اسے لازم ہونا چاہئے، اگر یہ وعدہ لازم قرار نہ دیا جائے تو اس سے بینک کو نقصان کا اندیشہ ہے۔

وعدہ کے بارے میں عام فقہاء کا موقف یہی ہے کہ یہ دیانتاً لازم ہوتا ہے اور اس کی خلاف ورزی گناہ کبیرہ کے زمرہ میں آتی ہے، لیکن قضاءً اس کا پورا کیا جانا لازمی نہیں ہے، یعنی کوئی شخص اگر اپنا وعدہ پورا نہ کرے تو اس کے خلاف عدالتی کارروائی نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی اس پر جبر کیا جاسکتا ہے۔

وعدہ کے لزوم سے متعلق جو شہادتیں ملتی ہیں، ان کے عمومی جائزہ سے یہ تأثر ملتا ہے کہ وہ معاملات میں لازمی ہونی چاہئے، خاص طور سے ایسی صورت میں جب کہ اس سے کسی کو نقصان پہنچنے کا امکان ہو۔

یا ایہا الذین آمنوا لم تقولون مالا تفعلون، کبر مقتا عند اللہ ان تقولوا مالا تفعلون۔ (الصف - ۳۱)	اے مومنو! تم ایسی باتیں کیوں کہا کرتے ہو، جو کیا نہیں کرتے، خدا اس بات سے سخت بیزار ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔
واوفوا بالعهد ان العهد کان مسئولا۔ (اسراء - ۳۴)	اور عہد کو پورا کرو اس لئے کہ اس کے بارے میں ضرور پرسش ہوگی۔
آیۃ المنافق ثلاث: اذا حدث کذب واذا وعد اخلف واذا ائتمن خان۔	منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب وہ بولے گا تو جھوٹ بولے گا، جب وعدہ کرے گا تو اس کی خلاف ورزی کرے گا، اور اگر امانت رکھائی جائے تو خیانت کرے گا۔

علامہ ابن حزم نے ان دلائل کے پیش نظر ہر فرد کے وعدہ کو لازم قرار دیا ہے:

والظاهر من هذه الادلة ان الوعد سواء کان بصلة او برام بغیر ذالک واجب	ان دلائل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وعدہ کا تعلق صلہ رحمی سے ہو، بھلائی کے کام سے یا کسی اور چیز سے

الوفاء به. اذ لم تفرق النصوص بين وعد و وعد، هذا ماروی عن ابن شبرمه حيث قال: الوعد كله لازم و يقضى به على الوعد و يجبر.

(المحلی ج ۸ المسئلہ ۱۱۲۵)

اس کا پورا کیا جانا ضروری ہے، اس لئے کہ دلائل میں وعدوں کے درمیان فرق نہیں کیا گیا ہے۔ یہ ابن شبرمہ کا خیال ہے، ابن حزم نے اسے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہر قسم کا وعدہ لازم ہو گا، اس کے مطابق فیصلہ کیا جائیگا، اور وعدہ کرنے والے پر جبر کیا جائے گا۔

امام بخاریؒ نے "کتاب الشہادات" کے تحت مستقل باب قائم کیا ہے "باب من امر بانجاز الوعد"۔ اس میں انہوں نے نقل کیا ہے کہ حسن بصری، سعید بن عمرو بن الاشرع، قاضی کوفہ اور سمرہ بن جندب وعدہ کے لزوم کے قائل تھے۔

یہ بات اس فتوی سے بھی واضح ہے، جو بیت التمویل الکویتی کے صدر احمد بزیع الیاسین نے اپنے شرعی مشیر الشیخ بدر المتولی عبد الباسط سے دریافت کیا تھا۔

نرجوا فتائنا فی مدی جواز قيامنا بشراء السلع والبضائع نقدا ابناء على رغبة ووعد من شخص ما، بانه معتمد اذا ماملكنا السلعة وقبضناها ان يشتريها منا بالاجل وباسعار على من اسعار نقدية.

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس سلسلہ میں کہ ہم کوئی چیز کسی کے اس وعدہ کی بنیاد پر نقد خریدیں کہ سامان کے حاصل کرنے اور اس پر قبضہ کے بعد وہ ہم سے ادھار خریدے گا جو نقد قیمت کے مقابلہ میں زیادہ ہوگی۔

ومثال ذالك ان يرغب احدالاشخاص فی شراء سلعة او بضاعة معينة لكنه لا يستطيع دفع ثمنها نقدا، فنعتقد بانه اذا اشتريناها وقبضناها سوف يشتريها منا بالاجل مقابل ربح معين مستار اليه وعده السابق.

بطور مثال کوئی شخص کسی متعین سامان کو خریدنے میں عین دلچسپی رکھتا ہو، لیکن اس کی نقد قیمت ادا نہ کر سکتا ہو تو اس خیال کے پیش نظر کہ اگر ہم وہ سامان خرید کر اس پر قبضہ کرلیں تو وہ ہم سے ادھار خرید سکتا ہے، ایک متعین منافع کے ساتھ جس کی تعیین پہلے سے کردی گئی ہو۔

الجواب:

ان ما صدر من طالب الشراء يعتبر

جواب:

خریداری کے خواہش مند کی جانب سے جو بات کی گئی

وعدا ونظرا لان الائمة قد اختلفوا فی هذا الوعد هل هو یلزم ام لا؛ فانی أمیل الاخذ برای ابن شبرمة الذی یقول: ان کل وعد بالالتزام لا یحل حراما ولا یحرم حلالا یکون وعدا ملزما قضاء ودیانة وهذا ما تشهد له ظواهر النصوص القرآنیة والاحادیث النبویة والاخذ بهذا المذهب الیسر علی الناس وعمل به یضبط المعاملات لهذا لیس هناك مانع من تنفیذ مثل هذا الشرط. (الفتاوی الشرعیة لبیت التمویل الکویتی، ج ۱/۱۳)

ہے، اس کی حیثیت وعدہ کی ہے، فقہاء کے درمیان اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ وہ لازم ہوگا یا نہیں؟ میرے خیال میں ابن شبرمہ کی رائے قابلِ ترجیح ہے، جن کا کہنا ہے کہ ہر وہ وعدہ جو کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام نہ کرتا ہو، اس کا پورا کرنا دیانتاً اور قضاءً لازم ہوگا، نصوص قرآنی اور احادیث نبویؐ کے جائزہ سے یہی تأثر ملتا ہے، اس نقطۂ نظر کے اپنانے میں لوگوں کے لئے سہولت ہے اور اس پر عمل کی صورت میں معاملات کی تنظیم اچھی طرح ممکن ہے، اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ اس قسم کے شرائط کے نفاذ میں کوئی حرج ہے۔

مؤتمر المصرف الاسلامی اوّل جس کا انعقاد ۹۷۹ء میں دبی میں ہوا تھا اور اس میں مختلف ممالک سے ۵۹ ممتاز علماء نے شرکت کی تھی، اس نے بھی مذکورہ صورت میں وعدہ کے لزوم کی توثیق کی ہے۔

بان مثل هذا التعامل یتضمن وعدا من عمیل المصرف، بالشراء فی حدود الشروط المنوه عنها، وعدا آخر من المصرف باتمام هذا البیع بعد الشراء طبقا الشروط.

یہ معاملہ دراصل دو وعدوں پر مشتمل ہے، ایک تو اس شخص کی جانب سے خریداری کا وعدہ جو بینک سے کسی متعین سامان کی خریداری کی درخواست کرتا ہے، دوسرا وعدہ بینک کی جانب سے ہوتا ہے کہ وہ متعینہ سامان حاصل کرنے کے بعد مذکورہ شخص کے ہاتھ فروخت کرے گا۔

ان مثل هذا الوعد ملزما للطرفین قضاء طبقا لاحکام المذهب المالکی وهو ملزم للطرفین دیانة طبقا لاحکام المذاهب الاخری.

اس قسم کا وعدہ فقہ مالکی کے مطابق فریقین کے لئے لازم ہوگا، جب کہ دیگر فقہی مذاہب اسے صرف دیانتاً لازمی قرار دیتے ہیں۔

وما یلزم دیانة، یمکن الالزام به قضاء اذا اقتضت المصلحة ذلك وامکن

جو چیز دیانتاً لازم ہو اسے قضاءً بھی لازم قرار دیا جا سکتا ہے، اگر مصلحت اس بات کا تقاضا کرے

للقضاء التدخل فيه۔ اس کے علاوہ عدالت کے لئے بھی اس میں مداخلت ممکن ہے۔

"المصرف الاسلامی" کی دوسری کانفرنس جو کویت میں ۱۹۸۳ئمیں منعقد ہوئی جس میں بارہ غیر سودی بینکوں کے علاوہ کئی ملکوں کے ممتاز علماء نے شرکت کی، اس نے بھی اس کی توثیق کی ہے۔

یقر المؤتمران المواعدہ علی بیع المرابحہ للآمر بالشراء بعد تملك السلعہ المشتراۃ وحیازتها ثم بیعها لمن امر بشرائها بالربح المذکور فی الموعد السابق هو امر جائز شرعا طالما کانت تقع علی المصرف الاسلامی مسؤلیة الهلاك قبل التسلیم وتبعه الرد فیما یستوجب الرد بعیب خفی۔

یہ کانفرنس اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ وعدہ جو خریداری سے متعلق مرابحہ کی بنیاد پر ہو اس کے تحت سامان کے حصول اور اس پر قبضہ کے بعد متعینہ منافع کے ساتھ خریداری کی درخواست کرنے والے کے ہاتھ فروخت کرنا شرعاً جائز ہے اگر سامان کی حوالگی سے پہلے اسلامی بینک اس کے ضائع ہونے کی صورت میں مسئول ہو اور کسی عیب کی صورت میں خریدار کو سامان لوٹانے کا حق حاصل ہو۔

ادھار قسطوں پر ادائیگی

عام طور سے یہ بینک اپنی خدمات کو زیادہ پرکشش اور مفید تر بنانے کے لئے عوام کو یہ سہولت دیتے ہیں کہ وہ مرابحہ کی بنیاد پر بینک سے سامان خریدیں اور اس کی ادائیگی ایک متعینہ مدت کے بعد کریں، یا قسطوں پر ادا کریں، ادھار یا قسطوں پر ادائیگی کی صورت میں بینک اپنا منافع عموماً نقد ادائیگی کے مقابلہ میں کچھ زیادہ رکھتا ہے۔

بعض فقہاء نے نقد کے مقابلہ میں ادھار قیمت زیادہ رکھنے کو جائز قرار نہیں دیا ہے، اس شبہہ کی بنیاد پر کہ قیمت میں اضافہ صرف مدت کی وجہ سے ہوتا ہے، جو کہ ربا کی علت میں سے ایک ہے۔

جمہور فقہاء نے ادھار قیمت نقد کے مقابلہ میں زیادہ رکھنے کو جائز قرار دیا ہے، اس لئے کہ یہ زیادتی تجارتی بنیاد پر باہمی رضامندی سے ہو رہی ہے، لہٰذا یہ اس آیت کے تحت جائز ہوگا، "الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم" اس کے علاوہ یہ کہنا کہ ہر وہ زیادتی جو مدت کی بنیاد پر ہو لازمی طور پر سود کے زمرہ میں شامل ہے صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ مدینہ سے بنو نظیر کے اخراج کے موقع سے

آپؐ نے مدت کی بنیاد پر قرض میں تخفیف کا حکم دیا تھا، اس لئے مرابحہ کی بنیاد پر فروخت کا عمل ادھار ہو یا قسطوں پر اس میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ یہ بات ضروری ہوگی کہ ادھار کی صورت میں مدت کی وضاحت کردی جائے۔

اذا کان الثمن مؤجلا وزاد البائع فیہ من اجل التأجیل جاز لان للاجل حصۃ من الثمن والی ھذا ذھب الاحناف والشافعیۃ وزید بن علی والمؤید باللہ وجمھور الفقھاء لعموم الادلۃ القاضیۃ بجوازہ ورجحہ الشوکانی۔

(فقہ السنہ ۳/۴۳)

اگر ادھار کی وجہ سے بیچنے والا قیمت میں زیادتی کردے تو یہ بات جائز ہوگی، اس لئے کہ قیمت کے تعین میں مدت ادائیگی کا اہم رول ہوتا ہے، فقہاء احناف، شوافع، زید بن علی، مؤید باللہ اور جمہور فقہاء کا یہی موقف ہے، ان واضح دلائل کی بنیاد پر جو اس سلسلہ میں ملتی ہیں علامہ شوکانی نے بھی اس رائے کو ترجیح دی ہے۔

قیمت کی ضمانت

غیر سودی ادارے جو مرابحہ کی بنیاد پر خریداروں کو ادھار یا قسطوں پر ادائیگی کی سہولت فراہم کرتے ہیں، انہیں عملی طور پر ایک بڑی دشواری پیش آتی ہے کہ خریدار معاہدہ کے مطابق وقت پر قیمت کی ادائیگی نہیں کرتے، اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے ادارے ادائیگی میں تاخیر کا کوئی معاوضہ وصول نہیں کرتے، اس لئے کہ یہ سود کے ضمن میں آئے گا، اس کی وجہ سے ان اداروں کو عموماً نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

اس نقصان سے بچنے کے لئے یہ ادارے اگر شخصی ضمانت رہن یا حوالہ وغیرہ کی شرط لگائیں تو یہ بالکل جائز ہوگا، فقہاء نے صراحت کے ساتھ اس بات کی اجازت دی ہے۔

یری الحنفیۃ جواز شرط الضمان فی العقد لانہ من الشروط التی تؤکد موجب العقد ومقتضاہ لکن جواز ھذا الشرط جاء بالاستحسان علی خلاف القیاس، ذالک ان الرھن والکفالۃ والحوالۃ عقود شرعت توثیقا للثمن فھی توجب

معاملات میں ضمانت کی شرط کو فقہاء احناف نے جائز قرار دیا ہے، اس لئے کہ یہ اس کی تکمیل میں کافی حد تک معاون ہوتا ہے، یہ جواز بطور استحسان ہے، ورنہ قیاس کا تقاضا ہے کہ ایسی شرط نہ لگائی جائے، یہ ضمانت رہن، کفالت یا حوالہ کے ذریعہ حاصل کی جاسکتی ہے، اس سے قیمت کی

تاکید ما اوجبہ البیع وھو الثمن .
(بدائع الصنائع ۱۸/۱۳)

ادائیگی کے امکانات کی مزید توثیق ہوتی ہے، جس کی ادائیگی بیع کی وجہ سے خریدار کے ذمہ لازم ہوتی ہے ۔

اس طرح ادائیگی میں تاخیر یا عدم ادائیگی کی صورت میں ان تجویزوں پر بھی عمل کیا جاسکتا ہے، جو "عالمی اسلامی بینک برائے سرمایہ کاری" کے شرعی مشیر ڈاکٹر حسین حامد حسان نے پیش کی ہیں، جو حسب ذیل ہیں :

۱۔ کسی حَکَم کی تعیناتی، جو ادائیگی میں تاخیر کے نتیجہ میں بینک کو پہنچنے والے نقصان کا اندازہ کرے اور پھر یہ رقم خریدار سے وصول کی جائے ۔

۲۔ بینک کو اس بات کا اختیار کہ بیع فسخ کر دینے کے بعد وصول شدہ قسطوں کو ضبط کرلے، تاکہ اس سے اس نقصان کی تلافی ہو سکے جو بینک کو پہنچا ہے ۔

۳۔ بقیہ قسطوں کی تحصیل اور فوری ادائیگی کا مطالبہ ۔

مذکورہ صورتوں میں سے کسی پر بھی بینک عمل کر سکتا ہے، اس لئے کہ قیمت کی عدم ادائیگی یا اس میں تاخیر اگر کسی معقول وجہ کے بغیر ہو تو یہ ایک طرح کا ظلم ہے "مطل الغنی ظلم" جمہور فقہاء نے ایسے شخص کے قید کئے جانے اور اس کی املاک کو فروخت کر کے قرض کی ادائیگی کی اجازت دی ہے، اس طرح بقیہ قسطوں کی تحصیل سے متعلق بھی صراحت موجود ہے ۔

علیہ الف ثمن جعلہ ربہ بخوما ان افعل بنجم حل الباقی فالامر کما شرطا .
(رد المحتار علی الدر المختار ۲۴/۴)

کسی پر ہزار درہم دین ہوں، مالک نے ادائیگی کے لئے قسطیں مقرر کر دی ہوں اور یہ شرط لگا دی ہو کہ ایک بھی قسط وقت پر وصول نہ ہوئی تو بقیہ مکمل دین فوراً وصول کیا جائے گا تو یہ بات جائز ہوگی ۔

خالد سیف اللہ رحمانی

حدیث کے مقبول و نامقبول ہونے کے اصول

حنفی نقطۂ نظر

(الف) اگر کوئی حدیث ایسے مسئلہ سے متعلق ہو جس میں عہد صحابہؓ میں اختلافِ رائے رہا ہو اور اس حدیث سے کسی نے استدلال کیا ہو تو علامہ سرخسی کی زبان میں اس بات کی علامت ہے کہ اس حدیث میں کہیں نہ کہیں کھوٹ موجود ہے اور یا تو یہ بعد کے راویوں کا سہو ہے، یا پھر یہ حدیث منسوخ ہے[1]۔

جیسے عہد صحابہؓ میں اس بات کا اختلاف تھا کہ جو باندی آزاد کے نکاح میں ہو، اس کی طلاق تین ہو گی یا دو؟ لیکن حدیث: "الطلاق بالرجال والعدۃ بالنساء" سے کسی نے استدلال نہیں کیا، اسی طرح نابالغ بچوں کے مال میں زکوٰۃ واجب ہونے کا مسئلہ صحابہؓ کے درمیان بھی اختلافی رہا ہے، لیکن حدیث: "ابتغوا فی اموال الیتامیٰ خیرا کیلا تاکلھا الصدقۃ۔" سے استدلال کرنا کسی صحابی سے منقول نہیں، اسی لئے حنفیہ کے یہاں ان احادیث کی تاویل کی گئی ہے۔

(ب) کسی روایت پر صحابہؓ کے عہد میں عمل نہ کیا گیا ہو، یا علانیہ اسے ترک کر دیا گیا ہو تو یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اس حدیث کا ظاہری مفہوم و مصداق مطلوب نہیں ہے، جیسے حدِ زنا کے سلسلے میں "جلد" (کوڑے لگانے) کے ساتھ "تغریب عام" (ایک سال کے لئے شہر بدر کرنے) کی سزا صحیح احادیث میں منقول ہے[2]۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ایک خاص واقعہ کے پسِ منظر میں فرمایا کہ آئندہ میں کسی کو شہر بدر کرنے کی سزا نہیں دوں گا۔ اس لئے حنفیہ نے اس حدیث کے ظاہر پر عمل کرنے کے بجائے یہ نقطۂ نظر اختیار کیا کہ "تغریبِ عام" کی سزا سیاست شرعیہ

---

(۱) اصول السرخسی ۱/۳۶۹۔ (۲) بخاری ۲/۱۰۰۸، ابوداؤد ۲/۶۱۰۔

کے قبیل سے ہے اور قاضی امیر کی صواب دید پر ہے۔ اسی طرح فتح خیبر کی نظیر حضرات صحابہؓ کے سامنے تھی، پھر بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فتح عراق کے موقع سے اراضیِ عراق کی تقسیم نہ فرمائی اس لئے حنفیہ کے نزدیک اراضیِ مفتوحہ کی بابت فیصلہ کرنے میں حکومت مصالح عامہ کے تحت فیصلہ کرنے کی مجاز ہے۔

(ج) اسی طرح صحابہؓ نے کسی روایت کو نقل کیا ہو جو اپنے معنیٰ و مصداق کے اعتبار سے واضح ہو، اس کے باوجود خود اس صحابیؓ کا فتویٰ یا عمل اس روایت کے خلاف ہو تو حنفیہ کے یہاں ایسی روایت بھی نامقبول ہے، جیسے حضرت ابوہریرہؓ سے "سورہرہ" کے سلسلہ میں دو دفعہ دھونے کی حدیث مروی ہے[1]، لیکن خود ان کا فتویٰ تین دفعہ دھونے کا ہے[2]۔ حنفیہ نے اس حدیث کو اصل بنایا اور سات بار والی روایت کو استحباب پر محمول کیا۔

اسی طرح ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ آپ سواری پر اکثر وتر ادا فرمایا کرتے تھے[3]، لیکن خود حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا معمول نقل کیا گیا ہے کہ وتر ادا کرنے کے لئے سواری سے نیچے اتر آتے تھے، لہٰذا حنفیہ نے اسی پر عمل کیا اور جس میں آپ کے سواری پر وتر پڑھنے کا ذکر ہے اسے تہجد پر محمول کیا، کیونکہ حدیث میں وتر کا لفظ تہجد کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے وہ روایت منقول ہے، جس میں عورت کے نکاح کے لئے ولی کو ضروری قرار دیا گیا ہے: "لا نکاح الا ولی" لیکن خود حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنی بھتیجی حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر کی لڑکی کا نکاح والد کی عدم موجودگی میں کیا ہے[4]۔ اسی لئے حنفیہ کے نزدیک بالغ لڑکی پر اولیاء کی ولایت استحبابی ہوگی، نہ کہ وجوبی۔

البتہ اس سلسلہ میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں: اول یہ کہ اگر صحابی کا عمل یا فتویٰ کسی حدیث کے خلاف ہو اور وہ حدیث ایسے مسئلہ سے تعلق رکھتی ہو کہ بعض لوگوں پر اس کا مخفی رہ جانا ناقابلِ قیاس نہ ہو تو یہ اس حدیث کے مقبول ہونے میں مانع نہیں ہے۔ جیسے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اس بات کے

---

(۱) مسلم، باب حکم ولوغ الکلب۔ (۲) طحاوی: باب سور الکلب۔

(۳) ترمذی: ۱/۱۰۸۔ (۴) المبسوط: ۵/۱۲۔

قائل نہ تھے کہ حائضہ طوافِ وداع ترک کر سکتی ہے۔ یا حضرت ابوموسیٰ اشعری کی رائے منقول ہے، کہ نماز کی حالت میں قہقہہ ناقضِ وضو نہیں، علامہ سرخسیؒ نے لکھا ہے کہ یہ ایسے ہی مسائل میں ہے"(۱)۔

دوسرے: اگر کسی حدیث میں ایک سے زیادہ معنوں کی گنجائش ہو اور کسی صحابیؓ نے اپنے اجتہاد سے ایک معنیٰ مراد لیا تو یہ حجت نہیں، کیونکہ ان کی بنیاد اجتہاد ہے، نہ کہ نص۔ "فالعبرۃ لما روی لا لما رأی۔ چنانچہ خرید و فروخت کے بارے میں۔ "المتبایعان بالخیار مالم یتفرقا"۔ مروی ہے۔ یہاں جمہور کے نزدیک: "تفرقِ ابدان" مراد ہے اور ایجاب و قبول مکمل ہونے کے بعد بھی طرفین کو "خیارِ مجلس" حاصل ہوتا ہے، حنفیہ کے نزدیک اس سے "تفرقِ اقوال" مراد ہے، یعنی جب تک ایجاب کے قبول کا اظہار نہ ہو جائے۔ بیع کو رد کرنے کا اختیار حاصل ہے، حالانکہ خود حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کے وہی معنیٰ مراد لینا ثابت ہے جو جمہور نے لیا ہے، لیکن چونکہ خود اس حدیث کے الفاظ میں ان دونوں معنوں کی گنجائش ہے، اس لئے حنفیہ کے یہاں روایت کے الفاظ زیادہ قابلِ لحاظ ہیں، نہ کہ راوی کا اپنا اجتہاد۔

حدیث کی ترجیح میں راوی کے تفقہ کا اثر

احناف کے یہاں بعض کتب اصول میں خبرِ واحد کے مقبول ہونے کے لئے یہ شرط بھی لگائی گئی ہے کہ اس کے رواۃ مقبول ہوں، لیکن حضرت الامام کے مجتہدات پر غور کیا جائے تو اس کی تصدیق دشوار ہے، کیونکہ کتنے ہی مسائل ہیں، جن میں حنفیہ نے ایسے راویوں کی روایت کو لیا ہے جو تفقہ میں معروف نہ تھے، ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر دو حدیثیں متعارض ہوں اور سند کے اعتبار سے دونوں ہی صحیح ہوں تو امام صاحب ایسی روایت کو ترجیح دیتے ہیں جو کہ "اصحابِ فقہ رواۃ" نے نقل کیا ہے، اس کی بہترین مثال امام ابوحنیفہؒ اور امام اوزاعیؒ کے درمیان دار الحناطین مکہ میں رفع یدین کے مسئلہ پر ہونے والا مناقشہ ہے، جس میں امام ابوحنیفہؒ نے راویوں کے تفقہ کو ملحوظ رکھ کر حماد بن ابراہیم عن علقمہ و اسود عن عبداللہ بن مسعودؓ کی سند کو "زہری عن سالم عن عبداللہ بن عمرؓ" پر ترجیح دی اور بہ مقابلہ

---

(۱) اصول السرخسی ۲/۸

قلت وسائط کے، راوی کے تفقہ کو آپ نے زیادہ اہم سمجھا۔

علامہ ابن ہمام نے اس مناقشہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

فرجح بفقہ الرواۃ کما رجح الاوزاعی بعلو الأسناد وھو المذھب المنصور عندنا۔[1]

جیسے امام اوزاعی علو سند کی بنیاد پر ترجیح دیا، اس طرح امام ابو حنیفہؒ نے راوی کے تفقہ کو وجہ ترجیح بتایا ہے، اور یہی ہمارے نزدیک مذہبِ منصور ہے۔

علامہ ابن ہمام نے "تحریر الاصول" میں بھی وجوہ ترجیح میں اس کا شمار کیا ہے اور اس سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ نکاح محرم کے مسئلہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کو ابو رافعؓ کی روایت پر ترجیح ہوگی[2]۔

بعض حضرات نے اس پر نقد کیا ہے کہ روایت حدیث کا تعلق بنیادی طور پر حفظ سے ہے، اس لئے روایتِ حدیث میں حفظ پر تفقہ کو ترجیح دینا قرینِ صواب نہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ روایات زیادہ تر بالمعنیٰ مروی ہیں نہ کہ باللفظ اور معانی حدیث کی حفاظت وہی کر سکتا ہے جو فہم بلیغ اور قلبِ عقول بھی رکھتا ہو، علامہ رازیؒ بھی فی الجملہ راوی کے تفقہ کو وجہ ترجیح قرار دیتے ہیں: "ان تفقہ الراوی مرجح بحال"[3] اور علامہ شوکانیؒ نے بھی اس نقطۂ نظر کی معقولیت کا احساس کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: "لانہ اعرف بمدلولات الالفاظ"[4]۔

علاوہ حنفیہ کے بعض دوسرے ائمہ حدیث وفقہ نے بھی اس اصول کو تسلیم کیا ہے، امام وکیعؒ نے ایک صاحب سے دریافت کیا کہ تم: "اعمش عن ابی وائل عن عبداللہ بن مسعود" اور "سفیان عن منصور عن ابراہیم عن علقمہ عن ابن مسعودؓ" میں سے کس سند کو ترجیح دیتے ہو؟ ان صاحب نے کہا کہ اعمش کی سند کو! وکیع نے اظہار حیرت کرتے ہوئے کہا کہ اعمش ابو وائل شیوخ ہیں اور سفیان منصور، ابراہیم اور علقمہ فقہاء اور جس حدیث کے راوی فقہاء ہوں وہ اس حدیث سے بہتر ہے، جس کو شیوخ نے نقل کیا ہو: "حدیث یتداولہا الفقہاء خیر

(۱) فتح القدیر: ۳/۱۱۔
(۲) دیکھئے: تیسیر التحریر: ۳/۱۶۷۔
(۳) المحصول: ۲/۴۵۴۔
(۴) ارشاد الفحول: ۲۶۷۔

من ان یتداولها الشیوخ "۔

حنفیہ اور احادیثِ مرسلہ :

اس طرح یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جہاں محدثین نے اصولِ روایت کے اعتبار سے ذخیرۂ حدیث کو پرکھا ہے اور اس کے لئے تحقیقِ رجال کا وہ عظیم الشان کام سرانجام دیا ہے کہ تاریخِ مذاہب میں ایک مثال نہیں مل سکتی اور مستشرقین تک نے اس کا اعتراف کیا ہے، ہاں فقہاء اور بالخصوص فقہائے احناف نے متن حدیث کو کتاب اللہ، شریعت کے عمومی اہداف و مقاصد اور مزاج و مذاق، نیز جو واقعات مروی ہیں ان کے تاریخی پسِ منظر کی روشنی میں پرکھنے کی جو کوشش کی ہے اور درایت حدیث کے جو اصول و قواعد قائم کئے ہیں ان کی داد نہ دینا بھی ناانصافی ہوگی۔ لیکن افسوس کہ تحقیقِ حدیث کے اس پہلو کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا، بلکہ فقہاء حنفیہ کو ان کی اس سعی مسعود پر بعض کوتاہ فہم اور کوتاہ بین اہلِ قلم نے "تارکِ حدیث اور متبع رائے" ٹھہرانا، حالانکہ یہ ایسا ظلم ہے کہ علم کی دنیا میں کم ایسا ظلم روا رکھا گیا ہوگا۔

اگر بہ نظرِ انصاف دیکھا جائے تو بہ مقابلہ دوسرے مکاتبِ فقہ کے حنفیہ کے یہاں احادیث سے اعتناء زیادہ نظر آتا ہے، اس سلسلہ میں فقہاء کے دو اصولی اختلاف کی طرف اشارہ کرنا مناسب محسوس ہوتا ہے، اوّل یہ کہ تابعینؒ اور تبع تابعین کی مرسل روایات میں درمیان کے واسطوں کو حذف کرکے براہِ راست آپؐ سے نقل کی گئی روایات حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک حجت ہیں، بشرطیکہ راوی کے بارے میں معلوم ہو کہ عام طور پر وہ ثقہ رواۃ ہی سے روایت لیتا ہے[1]۔ امام شافعیؒ اور بعد کے اہلِ علم نے عام طور پر سند میں انقطاع کی وجہ سے مراسیل کو قبول نہیں کیا ہے، حنفیہ نے مرسل روایات اور خاص کر امام ابراہیم نخعیؒ کی مراسیل سے بہ کثرت استدلال کیا ہے، جس کا اندازہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کی کتاب الآثار" سے کیا جا سکتا ہے۔

---

(۱) قفو الاثر / ۶۷۔

احناف کا مرسل کو قبول کرنا جہاں ان کی اس فکر کا غماز ہے کہ "دین میں نقل پر عمل، بہر حال عقل کو راہ دینے سے بہتر ہے"۔ وہیں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر ہے کہ بہت سے محدثینِ حدیث کو اس وقت مرسلاً نقل کرتے تھے جب متعدد شیوخ کے ذریعہ ان تک بکمال اعتبار و استناد یہ روایت پہونچتی تھی، حضرت حسن بصریؒ فرماتے تھے کہ جب کسی صحابیؓ کی روایت مجھ تک چار چار اصحاب کے ذریعہ پہونچتی ہے، تو میں ارسالاً روایت کرتا ہوں۔ "اذا اجتمع لی اربعة من اصحابة علی حدیث ارسلہ اسالاً"[۱] حضرت ابراہیم نخعیؒ کہا کرتے تھے کہ جب میں کسی حدیث کو براہِ راست حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف منسوب کروں تو سمجھنا چاہئے کہ میں نے ایک سے زیادہ لوگوں سے یہ حدیث سنی ہے: "اذا قلت قال عبد اللہ فھو عن غیر واحد عن عبد اللہ"[۲] اسی لئے حنفیہ نے نماز میں قہقہہ کے ناقضِ وضوء ہونے کے مسئلہ میں ابراہیم نخعیؒ کی مرسل روایت ہی کو اصل بنایا ہے[۳]۔

فقہ حنفی میں آثارِ صحابہؓ کی اہمیت

دوسرے جن مسائل میں احادیثِ مرفوعہ موجود نہ ہوں، کہا جا سکتا ہے کہ ان میں حنفیہ کے یہاں صحابہؓ کے فتاویٰ کی حیثیت قولِ آخر کی ہے اور عام طور پر وہ اس سے تجاوز نہیں کرتے، حنفیہ کے علاوہ حنابلہ کے سوا شاید ہی کسی دبستانِ فقہ میں آثارِ صحابہؓ کو اس درجہ اہمیت دی گئی ہو، چنانچہ اس سلسلہ میں حنفیہ کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) کوئی ایسا مسئلہ ہو جس میں قیاس کو دخل نہ ہو اور اس سلسلہ میں ایک ہی صحابیؓ کا قول منقول ہو، صحابہؓ کے درمیان اختلاف نقل نہ کیا گیا ہو تو اس قول پر عمل کرنا واجب ہے

ولا خلاف بین اصحابنا المتقدمین والمتاخرین ان قول الواحد من الصحابةؓ حجة فی مالا مدخل للقیاس فی معرفة	ہمارے اصحاب - متقدمین اور متاخرین - کے درمیان اس سلسلہ میں کوئی اختلاف نہیں کہ جن امور کا حکم جاننے میں قیاس کو دخل نہیں، ان میں ایک صحابی کا

---

(۱) اصول السرخسی - ۱/۳۶۱ -
(۲) تدریب الراوی ۱/۱۶۹ -
(۳) سنن دارقطنی ۱/۱۷۱ -

الحکم فیہ۔"[۱] قول بھی حجت ہے۔

چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے قول پر حیض کی کم سے کم مدت تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن، حضرت عبداللہ بن عمرو بن ابی العاص کے قول پر نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول پر حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت دو سال اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول پر مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم حنفیہ نے مقرر کی ہے، کیونکہ مقدار اور مدت کی تعیین میں اجتہاد کو کوئی دخل نہیں۔

(۲) کوئی ایسا مسئلہ ہو جس میں اجتہاد کی گنجائش ہو اور ایک ہی صحابیؓ کا قول منقول ہو، اس صورت میں اختلاف ہے۔ ابو جصاص رازی، ابو سعید بردعی، فخر الاسلام بزدوی، شمس الائمہ سرخسی اور ابو الیسر وغیرہ کی رائے پر اس صورت میں بھی قول صحابی حجت ہے اور اس پر عمل واجب ہے[۲]۔ اور نسفی کا بیان ہے کہ: علی ھذا ادرکنا مشائخنا[۳]۔

یہی رائے مالکیہ کی ہے، یہی ایک قول امام احمد کا ہے اور یہی امام شافعیؒ کا قول قدیم تھا[۴]۔

امام کرخی اور قاضی ابو زید دبوسی کا خیال ہے کہ ایسی صورت میں قولِ صحابی حجت نہیں، بلکہ قیاس پر عمل کیا جائے گا[۵]۔ یہی امام شافعیؒ کا قولِ جدید ہے[۶]۔ گو میرا خیال ہے کہ خود امام شافعیؒ کے اجتہادات سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ پہلے نقطۂ نظر اور اس کے دلائل پر امام سرخسیؒ نے شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے[۷] اور دوسرے نقطۂ نظر کو کرخی نے دلائل و براہین کی قوت کے ساتھ واضح کیا ہے[۸]۔ سرخسی نے اس صورت میں بھی قولِ صحابی کے معتبر ہونے کے سلسلہ میں امام ابو حنیفہؒ اور صاحبین کا رویہ اس طرح نقل کیا ہے:

---

(۱) اصول السرخسی: ۲/۱۱۰، نیز دیکھئے: التقریر والتحبیر: ۲/۳۱۱۔ (۲) التقریر والتحبیر: ۲/۳۱۰۔

(۳) کشف الاسرار مع نور الانوار: ۲/۱۷۴۔ (۴) التقریر والتحبیر: ۲/۳۱۰۔

(۵) حوالۂ سابق، نیز دیکھئے: الاقوال الاصولیہ للکرخی: ۹۲، باب قول الصحابی۔ (۶) دیکھئے: الاحکام فی اصول الاحکام للآمدی: ۲/۳۵۷۔ (۷) اصول السرخسی: ۲/۱۰۸۔

(۸) دیکھئے: الاقوال الاصولیہ، للامام کرخی: /۹۲۔

- قیاس کا تقاضا تھا کہ وضوء اور غسلِ جنابت دونوں ہی میں کلی اور ناک میں پانی ڈالنا سنت ہو، لیکن عبد اللہ ابن عباسؓ کے قول کی بنا پر قیاس کو ترک کر دیا گیا اور وضوء میں سنت اور غسل میں واجب قرار دیا گیا۔
- قیاس کا تقاضا تھا کہ خون زخم پر ظاہر ہو اور اپنی جگہ سے نہ بہہ پایا ہو، تب بھی وضوء ٹوٹ جاتا، لیکن عبد اللہ ابن عباس کے قول کی بنا پر ہم نے اس صورت کو ناقضِ وضوء قرار نہیں دیا۔
- اگر کسی شخص کی ایک شب و روز یا اس سے کم نمازیں بے ہوشی کی حالت میں گزر جائیں تو از روئے قیاس قضا واجب نہ ہونی چاہئے، لیکن حضرت عمار بن یاسر کے قول کی بنا پر قضاء واجب قرار دی گئی۔
- از روئے قیاس مریضِ موت کا اپنے وارث کے حق میں اقرار معتبر ہونا چاہئے، لیکن حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے قول پر اس کو نامعتبر قرار دیا گیا۔
- کوئی شخص اس طرح خرید و فروخت کا معاملہ طے کرے کہ اگر میں تین دنوں تک قیمت ادا نہ کر پایا تو ہمارے درمیان بیع نہیں، تو قیاس کا تقاضا ہے کہ یہ معاملہ فاسد ہو، لیکن حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ نے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے قول پر اس معاملہ کو درست قرار دیا ہے۔
- بیع سلم میں "راس المال" کی مقدار نہ بتائی، بلکہ اس کی طرف اشارہ کر دیا تو بہ تقاضاء قیاس معاملہ کو درست نہ ہونا چاہئے، لیکن عبد اللہ بن عمرؓ ہی کے قول پر امام ابو حنیفہؒ نے اس کو درست قرار دیا ہے۔
- اگر "اجیر مشترک" کے پاس سے سامان کسی ایسے سبب سے ضائع ہو گیا جس سے بچنا بھی ممکن تھا تو قیاس یہ ہے کہ اجیر پر اس کا ضمان نہ ہو، لیکن امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کی بنا پر اس کو ضامن قرار دیا۔
- امام محمدؒ نے محض حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور حضرت جابرؓ کے قول کی بنا پر حاملہ عورت کو ایک سے زیادہ طلاق دینے کو خلافِ سنت قرار دیا۔[1]

---

(۱) ملخص از: اصول السرخسی: ۲/۶-۱۰۵۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ محض چند مثالیں ہیں، ورنہ فقہ حنفی میں اس کی بہت سی نظیریں ملتی ہیں کہ قیاس واجتہاد کے بجائے "اقوالِ صحابہؓ" کو مشعلِ راہ بنایا گیا اور عقل پر بہر حال نقل کو ترجیح دی گئی ہے۔ فقہ حنفی کے اس مزاج و مذاق اور مسلک وطریق پر خود امام صاحب کی صراحت شاہد عدل ہے کہ:

ان لم اجد فی کتاب اللہ ولا سنۃ رسول اللہ اخذت بقول اصحابہ آخذ بقول من شئت وادع من شئت منھم ولا اخرج من قولھم إلی قول غیرھم۔

اگر میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول میں حکم نہیں پاتا ہوں تو آپؐ کے اصحابؓ کے قول کو لیتا ہوں اور ان میں سے جس کا قول چاہتا ہوں اور جس کا چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں لیکن اقوالِ صحابہؓ سے دوسرے اقوال کی طرف نہیں جاتا۔

اب اگر کسی خاص مسئلہ میں امام صاحبؒ نے قولِ صحابی کو نہ لیا ہو تو سمجھنا چاہئے کہ اس کی کوئی اور وجہ ہوگی، یا صحابہؓ میں اس مسئلہ میں ایک سے زیادہ رائیں رہی ہوں گی، جو امام صاحبؒ کے علم میں آئی ہوگی، انہیں میں آپ نے ترجیح کا راستہ اختیار کیا ہوگا۔

(۳) اگر کسی مسئلہ میں صحابہؓ کے ایک سے زیادہ اقوال ہوں تو پھر امام صاحب ان میں سے انتخاب کرتے ہیں اور جو قول قرآن سے قریب تر اور مزاجِ دین سے موافق تر محسوس ہوتا ہو اس کو اختیار کرتے ہیں۔

(۴) فقہ حنفی کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب بعض اوقات آثار صحابہؓ سے خبرِ واحد میں تخصیص کے بھی قائل ہیں، مثلاً: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ:

لیس علی المسلم فی عبدہ ولا فرسہ صدقۃ

مسلمان پر اس کے غلام اور گھوڑے میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ گھوڑوں میں زکوٰۃ کا واجب نہ ہونا ان گھوڑوں کے ساتھ مخصوص ہے جو جہاد کے لئے استعمال کئے جائیں[1]۔ ایسے ہی مرتد کے بارے میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

---

(۱) البحر المحیط: ۳/۳۹۸۔

من بدل دینہ فاقتلوہ۔ جو اپنا دین بدلے اسے قتل کر دو۔

اور عبداللہ بن عباسؓ ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ عورت مرتد ہو جائے تو اسے قتل نہ کیا جائے چنانچہ حنفیہ نے عورت کو ارتداد کی بنا پر سزائے قتل سے مستثنیٰ کیا ہے، اسے قید میں رکھا جائے گا، تاآنکہ وہ تائب ہو جائے۔

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

اذا أقیمت الصلوٰۃ فلا صلوٰۃ الا المکتوبۃ۔(۱) جب نماز قائم کی جائے تو سوائے فرض کے اور کوئی نماز نہیں۔

لیکن حضرت عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر اور ابوالدرداء رضی اللہ عنہم سے خاص طور پر نماز فجر میں اقامتِ نماز کے بعد بھی سنت پڑھنا ثابت ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے اسی کو اختیار کیا۔

حدیثِ ضعیف بھی قیاس سے مقدم

حنفیہ کے یہاں عمل بالحدیث کا اس درجہ اہتمام ہے کہ ان کے یہاں یہ بات اصول کے درجہ میں ہے کہ جن مسائل میں کوئی صحیح اور حسن حدیث موجود نہ ہو، لیکن ایسی ضعیف روایات موجود ہوں جن کے راوی پر کذب کی تہمت نہ ہو تو بمقابلہ قیاس کے ایسی ضعیف احادیث پر عمل کیا جائے گا۔ مشہور محدث اور فقیہ ملا علی قاری نے حنفیہ کا مذہب اس طرح بیان کیا ہے:

ان مذھبھم تقدیم الحدیث الضعیف علی القیاس المجرد الذی یحتمل التزییف۔(۲) حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ حدیثِ ضعیف مجرد قیاس۔ جس میں غلطی کا احتمال ہے۔ پر مقدم ہے۔

علامہ حصکفی نے حدیثِ ضعیف پر عمل کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

شرط العمل بالحدیث الضعیف عدم شدۃ ضعفہ وان یدخل تحت اصل عام وان لا یعتقد سنیۃ حدیثِ ضعیف پر عمل کرنے کی شرط یہ ہے کہ ضعف شدید نہ ہو، وہ کسی اصل عام کے تحت آتا ہو اور اس حدیث سے

---

(۱) ترمذی: ۲/۸۲، باب ما جاء اذا أقیمت الصلاۃ۔ (۲) مرقاۃ المفاتیح: ۱/۳۔

ذلك الحديث۔ | ثابت حکم کے مسنون ہونے کا عقیدہ نہ رکھے۔

اور شامی شدتِ ضعف کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

شدید الضعف ھو الذی لا یخلو طریق من طرقہ عن کذاب او متھم بالکذب[1]۔	شدید ضعیف وہ حدیث ہے جس کی کوئی سند جھوٹے یا جھوٹ سے فہم راوی سے خالی نہ ہو۔

نہ صرف حدیث کے قبول ورد، بلکہ اس کی توجیہ وتاویل کے باب میں بھی علامہ ابن حزم کیسی شمشیر بے نیام ہیں، وہ محتاج اظہار نہیں، لیکن انہیں بھی اعتراف ہے کہ

جمیع الحنفیة مجمعون علی ان مذھب ابی حنیفة ھی ان ضعیف الحدیث عندہ اولی من الرائے[2]۔	تمام حنفیہ اسی بات پر متفق ہیں کہ ابو حنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ ضعیف حدیث ان کے نزدیک رائے سے بہتر ہے۔

اور علامہ ابن قیم رقم طراز ہیں:

واصحاب ابی حنیفة مجمعون علی ان مذھب ابی حنیفة ان ضعیف الحدیث عندہ اولی من القیاس والرأی، وعلی ذلك مبنی مذھبہ کما قدم حدیث القھقھة مع ضعفہ علی القیاس والرأی[3]	امام ابو حنیفہؒ کے اصحاب اس بات پر متفق ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کا مذہب قیاس ورائے کے مقابلہ ضعیف ضعیف حدیث کا راجح ہونا ہے، یہی آپ کا مذہب ہے، چنانچہ امام صاحبؒ نے قہقہہ سے وضوء ٹوٹنے والی حدیث کو قیاس و رائے پر مقدم رکھا۔

اس لئے حنفیہ کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ اپنی رائے کے مقابلہ احادیثِ صحیحہ ثابتہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں، یا تو ان کے منہج استدلال سے ناواقفیت کے باعث ہے اور یہ منہج اصولی طور پر محدثین وسلف صالحین کے نزدیک قریب بہ قریب متفق علیہ ہے، یہ اور بات ہے کہ دوسرے مکاتب فقہ میں اصول روایت پر قناعت کیا گیا اور وجوہِ درایت پر کم توجہ دی گئی اور حنفیہ نے عملی طور پر اس کو برتا ہے، یا

---

(۱) رد المحتار، ۱/۸۷۔ (۲) مقدمہ فی علوم الحدیث للتھانوی۔ ۶۹۔

(۳) اعلام الموقعین، ۱/۷۷۔

پھر یہ بہتانِ عظیم اور کذبِ اثیم ہے۔ "والی اللہ المشتکی وبہ التوفیق وھو المستعان"۔

خلاصۂ مقالہ

حاصل یہ ہے کہ:

(۱) امام ابوحنیفہؒ کی علمی نشوونما جس شہر (کوفہ) میں ہوئی، وہ خلافتِ راشدہ ہی کے دور میں اکابر صحابہؓ وتابعین، اور فقہاء ومحدثین کا مرکز بن گیا تھا اور اس شہر کی حیثیت مسلمانوں کے سیاسی دار الخلافہ کے علاوہ علمی، فکری اور ثقافتی مرکز کی ہوگئی تھی، مختلف علوم وفنون کے ماہر اہلِ علم کے اس اجتماع نے امام ابوحنیفہؒ کی فقہی فکر پر گہرا اثر ڈالا۔

(۲) عہدِ صحابہؓ ہی سے ایک گروہ ظاہر حدیث پر مانع تھا جو اصحاب الحدیث کہلاتے تھے، اور دوسرا حدیث کے معانی ومقاصد میں غواصی کا قائل، یہ "اصحاب الرائے" کہلاتے تھے، امام ابوحنیفہؒ ان صحابہ کے علوم اور طریقۂ فکر کے وارث بنے، جو اصحاب الرائے تھے۔

(۳) جہاں محدثین نے حدیث کی نقد وتحقیق میں رجال واسناد پر توجہ کی، وہیں فقہاء اور خصوصاً فقہاءِ احناف نے درایت کے نقطۂ نظر سے متن حدیث کی تحقیق پر توجہ دی۔

(۴) حنفیہ نے متن حدیث کی تحقیق میں جن خارجی عوامل سے مدد لی، ان میں چند اہم یہ ہیں:

(الف) مضمون حدیث کی قرآن پاک سے مطابقت۔

(ب) مضمونِ حدیث کی شریعت کے قواعدِ عامہ سے ہم آہنگی۔

(ج) مضمونِ حدیث کا علماءِ امت میں قبول واعتبار حاصل کرنا۔

(د) مضمونِ حدیث کے بارے میں صحابہؓ کے نقطۂ نظر سے استفادہ۔

(ھ) حدیث کی ترجیح میں راوی کے تفقہ کی اہمیت۔

حنفیہ کے یہاں یہ مقابلہ دوسرے مکاتبِ فقہ کے عمل بالحدیث کا اہتمام زیادہ ہے اور اس سلسلہ میں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ حنفیہ کے یہاں تابعین اور تبع تابعین کی مراسیل بہ ظاہر سند میں انقطاع کے باوجود معتبر ہیں اور صحابہؓ کے فتاوی کو بھی خصوصی اہمیت

دی گئی ہے، بلکہ جہاں کوئی صحیح یا حسن روایت موجود نہ ہو، وہاں ایسی ضعیف روایت بھی معتبر ہے، جس کا راوی کذب سے متہم نہ ہو۔

زندگی

محمد رضوان القاسمی

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے تجربات

ھندوستان کے جن کتب خانوں کو مخطوطات اور بعض دیگر اعتبارات سے ملکی اور غیر ملکی سطح پر وقعت، عظمت، اہمیت اور شہرت حاصل ہے، ان میں "خدا بخش اورئنٹیل پبلک لائبریری پٹنہ" بھی شامل ہے، اس لائبریری کو بارہا دیکھنے کا موقعہ ملا اور جب بھی دیکھا اس کی خوش سلیقگی اور حُسنِ انتظام نے مجھے متاثر کیا، جس طرح انسانوں کی عمریں ڈھلتی ہیں، کتابوں کی عمریں بھی ڈھلتی ہیں، لیکن مستعد انسان اپنی ڈھلتی عمر کو سنبھالا دینے اور اسے اچھی اور بہتر حالت میں رکھے رہنے کے لئے حفظانِ صحت کے اصول کا لحاظ رکھتا ہے، طبیبوں سے مشورہ لیتا رہتا ہے، مضر غذاؤں اور غیر صحت مند آب و ہوا سے اپنے آپ کو بچاتا ہے۔

خدا بخش (۱۸۴۲ — ۱۹۰۸ء) کو خدا بخشے کہ انہوں نے اپنے جذبۂ دروں اور اخلاصِ نیّت کی بنیاد پر جو لائبریری قائم کی تھی، ظاہری اعتبار سے اس لائبریری کی حالت اس انسان سے کم نہیں ہے جو اپنی جسمانی صحت اور روحانی توانائی کا خاص خیال رکھتا ہے، خدا بخش لائبریری کی یہی وہ جسمانی صحت اور روحانی توانائی کا کرشمہ ہے کہ بہت سی کتابیں جو "پیرانہ سالی" کی سرحدوں میں داخل ہیں مگر ان کے چہرے پر نکھار اور بہار ہے، گرد و غبار کا "غازہ" بھی نہیں ہے۔ اور ان کو دیکھنے سے ان کا فطری جمالیاتی پہلو نظر کے سامنے آشکارا ہوتا ہے۔ خدا بخش لائبریری کی یہی وہ خصوصیت ہے

جس کی وجہ سے اہلِ علم اسے ہندوستان کی "زندہ لائبریوں" میں شمار کرتے ہیں، اس کی زندگی اور زندہ دلی ہی کی علامت ہے کہ ہر سال سالنامہ "جنرل" شائع ہوتا ہے جو بلاشبہ علم وفن کا خزینہ اور حکمت ومعرفت کا گنجینہ ہوتا ہے۔ یہاں ہر سال مختلف موضوعات پر سمینار بھی منعقد ہوتے ہیں، مفید اور نادرو نایاب کتابیں بھی طبع ہوتی ہیں، نئے لوگوں کی نئی کتابیں بھی نئے رنگ اور جدید آہنگ سے منظرِ عام پر آکر دل کو سرور اور نظر کو نور بخشتی ہیں۔

خدابخش لائبریری سے جو کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں ایک کتاب کا نام ہے "شخصیات اور واقعات جنہوں نے مجھے متاثر کیا" (۲۷۶) صفحات پر مشتمل کتاب کے مرتب جناب جنید احمد ہیں، یہ کتاب مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ اُردو بازار دہلی سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ مرتب جناب جنید احمد نے ایسی تیرہ اہم علمی و ادبی شخصیتوں کا انتخاب کیا ہے جنہیں متعدد شخصیات اور واقعات نے متاثر کیا ہے۔ اِن تیرہ شخصیتوں نے ایسی شخصیات اور واقعات کا تذکرہ اپنے مخصوص، دلچسپ ادیبانہ انداز میں کیا ہے۔ زیر تذکرہ کتاب سے متعلق مرتّب کی یہ وقیع اور بلیغ سطریں پڑھیئے :-

> "نئی نسل کی ذہنی تشکیل کے ذمہ دار وہ دانشور بھی ہیں جن کی علمی اور ادبی تحریریں ہم ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں اور وہ مدبّر بھی جو نئی سیاسی اور سماجی ڈھانچے کی تعمیر میں مصروف ہیں۔
>
> یہ جاننے کی خواہش بڑی فطری ہے کہ خود ان لوگوں کی ذہنی تشکیل میں کن عناصر اور کیسے کیسے حالات نے حصہ لیا ہے، خود ان کی زندگی میں وہ شخصیتیں آچکی ہیں جو ان کے دل و دماغ پر لافانی نقوش چھوڑ گئی ہیں، وہ کیسی شخصیتیں تھیں، اس کا جواب مختلف اہلِ علم اور اہلِ قلم حضرات نے ان مضامین میں دیا ہے جو آپ کے سامنے اسی کتاب کی شکل میں آرہے ہیں۔
>
> لکھنے والوں میں پُرانی وضع کے بزرگ بھی ہیں اور نئے طرز

فکر کے علمبردار بھی، اور کچھ ایسے حضرات بھی ہیں جنہوں نے جدید و قدیم کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اس اعتبار سے یہ مضامین صرف تنوع نہیں بلکہ دل چسپ اور بصیرت افروز بھی ہیں، ان میں نہ صرف عظیم واقعات اور حادثات اور عظیم شخصیات کا ذکر ہے بلکہ زندگی کے بعض بہت چھوٹے چھوٹے واقعات اور نہایت حقیر لوگوں کا تذکرہ بھی ہے، ان چھوٹوں اور حقیروں نے جس طرح آج کے بڑوں کو متاثر کیا ہے وہ اس کا ثبوت ہے کہ زندگی میں چھوٹے اور بڑے کی تقسیم کچھ زیادہ صحیح نہیں ہے۔ انتہائی حقیر چیزیں بھی انتہائی اہم ہوتی ہیں۔ اور اس حقیقت کی گواہی ہمارے یہ ہر دلعزیز ادیب اور مدیر خود ہیں، آج جن کے علم و فن کا اعتراف دوسرے ممالک میں بھی کیا جا رہا ہے۔"

(شخصیات اور واقعات، جنہوں نے مجھے متاثر کیا، صفحہ ۸ ۔ ۷)

کتاب "شخصیات اور واقعات، جنہوں نے مجھے متاثر کیا"، میں جن تیرہ اہلِ علم و قلم اور اصحابِ شعر و ادب کے مضامین ہیں، ان میں آل احمد سرور، ڈاکٹر محمد اشرف، پنڈت سندر لال، نیاز فتحپوری، سجاد ظہیر، کرشن چندر، احمد عباس، مولانا عبدالماجد دریا بادی، سلمیٰ صدیقی، عصمت چغتائی، سردار جعفری، حمیدہ سلطان اور ڈاکٹر گیان چند شامل ہیں، فی الوقت راقم الحروف کے پیشِ نظر مولانا عبدالماجد دریا بادی کے تحریر کردہ مضمون کا آخری حصہ ہے جو نہایت اہم ہے۔ ایک انسان اپنی زندگی کے لئے اس سے بہت کچھ سیکھ سکتا اور سامانِ عبرت جمع کر سکتا ہے۔

کثیر التصانیف اور "سچ" "صدق" اور "صدقِ جدید" کے ایڈیٹر مولانا عبدالماجد دریا بادی (۱۹۷۷ ـــ ۱۸۹۲ء) کے بارے میں اہلِ علم جانتے ہیں کہ وہ ماہرِ فلسفہ و نفسیات تھے، صاحب طرز ادیب تھے، نقد و تبصرہ اور

طنز نگاری میں اپنی نظیر آپ تھے، زبان و بیان پر انہیں قدرت تو تھی ہی مگر اس میں ان کی ندرت کے قائل بڑے بڑے نادر روزگار بھی رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اردو اور انگریزی میں تفسیر قرآن کی سعادت بھی بخشی، ان اوصاف و کمالات کے ساتھ اسلامی حمیت، ملی غیرت، باطنی نسبت اور "مرشد تھانویؒ" سے ارادت کے اعتبار سے بھی اپنی ایک شناخت اور پہچان رکھتے تھے، زیرِ تذکرہ کتاب میں مولانا دریابادی کا مضمون صفحہ (۱۸۵) سے (۱۹۲) تک ہے گویا مضمون آٹھ صفحات پر مشتمل ہے، مضمون کا آخری حصہ جو (۱۹۰) سے شروع ہوتا ہے، وہ خوب ہی نہیں خوب تر ہے، بلاشبہ ان کا یہ مضمون ان کی پچاسی (۸۵) سالہ زندگی بلکہ کہنے کی اجازت ہو تو اس پوری کتاب کا حاصل اور خلاصہ ہے۔ مولانا دریابادی کے مضمون کا یہ حصہ اس لائق ہے کہ اس سے ہر خاص و عام فائدہ اٹھائے اور اپنی زندگی کے لئے اسے سرمۂ بصیرت و بصارت بنائے، کہنے کو جملہ آٹھ باتیں ہیں مگر اس میں بچپن، جوانی، کہولت، بڑھاپا، ہر زمانے کے لئے "پاٹھ" (سبق) آگیا ہے۔ اردو میں "بقامت کہتر، بقیمت بہتر" اور "دریا بکوزہ" کا محاورہ بہت عام ہے۔ مولانا دریابادی کی ان آٹھ باتوں میں ان اردو محاوروں کی بہترین تعبیر ملتی ہے۔ مولانا دریابادی تحریر فرماتے ہیں:۔

> "ذاتی اور اجتماعی دونوں قسم کی زندگیوں میں اتنی عمر گذار کر جو خاص خاص تجربے حاصل ہوئے، انہیں نمبروار ذیل میں درج کئے دیتا ہوں کہ شاید ان سے کسی دوسرے کو کچھ نفع حاصل ہو جائے۔

> (۱) صحتِ جسمانی کا اہتمام، سارے بدنی شعبوں میں شروع ہی سے ضروری ہے، بغیر اس کا خیال کئے نادانستہ ایسی ایسی غلطیاں صادر ہو جاتی ہیں اور ایسی ایسی بے احتیاطیوں کی عادت پڑ جاتی ہے کہ آگے چل کر تلافی بہت دشوار ہو جاتی

ہے اور سنبھلنے اور سُدھرنے کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہتی آنکھ، دانت، کان، جسم کا ہر ہر عضو ایک بڑی نعمت ہے اور نعمت کا قاعدہ ہے کہ بے پروائی اور ناقدری کے بعد چھن ہی جاتی ہے۔

(۲) یہی حال دینی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا ہے، اگر شروع ہی سے ان کی جڑیں مضبوط نہ ہوں تو آئندہ ہمیشہ خطرے محسوس ہوتے رہیں گے اور یکسوئی اور دل جمعی، عمر کی کسی منزل پر بھی پہنچ کر مشکل ہی ہے۔

(۳) دنیا میں اگر کوئی بڑا کام، مستقل کام انجام دے جانا ہے تو اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ اپنے زعم و پندار میں اپنے کو بڑا سمجھ کر اُچھالنے لگئے، یہ راہ ناکامی کی ہے، کامیابی اگر مقصود ہے تو اپنے کو سب سے چھوٹا بنا کر رکھئے، دبائیے نہیں، خود دبئے، دنیا خود ہی آپ کو اپنائے گی اور آنکھوں پر بٹھائے گی۔ خود غرضی، خود بینی اور خودستائی کا راستہ دین تو دین، دنیا میں بھی نقصان و خسران ہی کا ہے۔

(۴) دیانت اور سچائی کو اپنا شعار بنائے رکھئے، جو دوسروں کو دھوکا دیتا ہے وہی دھوکا کھاتا بھی ہے اور جو دوسروں کو گرانے کی فکر میں لگا رہتا ہے وہ آخر خود ہی گرتا ہے، خواہ اس نتیجہ کے ظہور میں دیر کتنی ہی لگے۔ "خدا کی خدائی میں دیر ہے، اندھیر نہیں" یہ مقولہ بڑے تجربے کا ہے۔

(۵) جذبات کو قابو میں رکھنے کی مشق شروع ہی سے ضروری ہے، یہ سمجھنا کہ شباب گذر جانے پر جذبات خود ہی قابو میں آجائیں گے، ایک شدید مغالطہ ہے۔

(۶) ماں کی محبت اور ماں کی خدمت کا وَلولہ ایک بڑی دولت

ہے، دنیا کی نعمتیں ایک طرف اور یہ ایک نعمت ایک طرف۔ اس کی قدر ایک خاص سن آجانے کے بعد ہوتی ہے۔

(۷) آخرت کا عقیدہ عقلی، منطقی، کلامی پہلوؤں سے قطع نظر عملی اعتبار سے بھی بڑا ہی قیمتی عقیدہ ہے، اپنے دل میں جب سے یہ عقیدہ اُترا، پوری زندگی بامعنیٰ و بامقصد بن گئی، اس کے قبل افلاطون اور ارسطو، کینٹ اور ہیگل، مل اور اسپنر کو چاٹ جانے کے باوجود یہی زندگی گاندھی جی کے پُرمعنی الفاظ میں ایک "بے پتوار کی کشتی" تھی۔

(۸) ہر معصیت، ہر نفس پرستی کا داعیہ جب تک ضعیف و خفیف رہتا ہے، عقلی دلائل روک تھام کے لئے کافی ہو جاتے ہیں، لیکن وہی جذبۂ نفسانی جب طوفان کی شدت اختیار کر لیتا ہے تو عقل و استدلال کے پیر اکھڑ جاتے ہیں اور بدترین بدنفسی اور گندگی کے لئے یہی عقل کو کوئی نہ کوئی حیلہ جواز مل ہی جاتا ہے اس آخری مرحلہ پر نفس سے مقاومت اور کامیاب مقاومت (مدافعت، مقابلہ) کی قوت صرف خوفِ خدا میں ہے، اس کے سوا کسی چیز میں نہیں۔"

(شخصیات اور واقعات، جنہوں نے مجھے متاثر کیا، صفحہ ۱۹۰ تا ۱۹۲)

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی ذاتی اور اجتماعی دونوں قسم کی زندگیوں میں طویل عمر گذار کر تجرباتی حیثیت سے جو آٹھ باتیں تحریر فرمائی ہیں، ان پر جس قدر غور کیا جائے اسی قدر ان کی افادیت، نافعیت اور اہمیت سامنے آئے گی اور دل ودماغ دونوں ان کے اثرات کو قبول کرتے ہوئے عمل کے لئے راہوں کو ہموار کریں گے۔ تاہم ان سطروں کو لکھتے ہوئے مجھے مولانا دریابادی کی کتاب "آپ بیتی"، یاد آرہی ہے (ص ۴۰۳) صفحات پر مشتمل اس کتاب کو پہلی دفعہ ۱۹۷۸ء میں مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ نے شائع کیا تھا۔ (۵۲) ابواب پر مشتمل یہ

کتاب دل چسپ اور معلومات افزا ہے، مولانا نے اپنی اس "آپ بیتی" میں نجی زندگی کی بعض باتیں بھی بے تکلفی کے ساتھ لکھ دی ہیں۔ شاید اس میں ان کے ماہر طبعیات اور نفسیات کا اثر ہو۔ اس کتاب کے (۴۹) ویں باب کا عنوان ہے "عام نتائج و تجرباتِ زندگی کا نچوڑ"۔ یہ باب چھ صفحات (۳۷۶ تا ۳۸۱) پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں بھی مولانا نے نہایت مفید اور کار آمد باتوں کا تذکرہ کیا ہے ذیل میں افادۂ عام کی خاطر ان باتوں کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:۔

"کتاب، بلکہ کہنا چاہئے کہ کتابِ زندگی کا مشکل ترین باب یہی ہے، ۷۵ سال کی زندگی کا خلاصہ تجربات میں کیا لکھا جائے اور کیا چھوڑا جائے؟ جی میں تو بے اختیار یہی آرہا ہے کہ داستانِ زندگی (آہ کہ کتنی لذیذ اور آہ کہ کتنی تلخ، دونوں ایک ہی وقت میں) کُل کی کُل بغیر ایک حرف چھوڑے دہرا دی جائے ـــــ داستانِ زندگی کے دہرانے میں لگتا ایسا ہے کہ جیسے زندگی خود اپنے کو دہرا رہی ہے۔ سوچنے بیٹھئے تو اپنی زندگی قابلِ صد نفریں و مستحقِ ملامت، اور نہ سوچئے تو جانِ عزیز سے بڑھ کر عزیز، لذیذ کوئی شئے ممکن نہیں۔

(۱) سب سے پہلی بات تو یہ خیال رکھنے کی ہے کہ طبعی تقاضا و شوق اور چیز ہے اور ہوس اور چیز، بہ قول حضرت اکبر الٰہ آبادی:

ع کہنے کی ایک حد ہے بکنے کی حد نہیں

جو فرق کہنے اور بکنے میں ہے وہی طبعی تقاضے اور ہوس میں ہے: ع وہ راہبر کی ہدایت، یہ رہ گذر کا فریب

طبعی تقاضوں کی تکمیل کی جا سکتی ہے لیکن ہوس کی آگ بجھانے کے لئے کوئی حد و نہایت نہیں۔ ہوس رانی جتنی بھی کیجئے گا، طبیعت بجائے آسودہ ہونے کے حریص سے حریص تر ہوتی

جائے گی، آگ بجھنے کے بجائے بھڑکتی ہی جائے گی، ضرر و زیاں صریح واقع ہوتا جائے گا لیکن طبیعت کو اس کا احساس ہی سرے سے جاتا رہے گا ———— نفس امارہ بڑا منطقی، بڑا افقیہ واقع ہوا ہے، ہر نفس پرستی، ہر ہوسناکی اور اس سے پیدا ہونے والے ہر ضرر و زیاں کی کوئی نہ کوئی خوبصورت سی تاویل و توجیہ ہر بار کرے گا اور ھل من مزید کے نعرے لگاتا ہوا آپ کو برابر مغالطہ میں مبتلا اور دھوکے میں الجھائے رکھے گا، لازم ہے کہ ہر خواہشِ نفس پر حاکم طبیعت کو نہیں، عقل کو رکھئے اور عقل کی حاکمیت کا نفاذ بڑی سختی سے کرتے رہیئے۔ ہیجانِ نفس کے وقت (عام اس سے کہ وہ ہیجان غصہ کا ہو، حب جاہ کا ہو، حرص مال کا ہو، شہوتِ جنسی کا ہو) عقل تک اندھی اور مغلوب ہو جاتی ہے، ایسے موقعہ پر دست گیری شریعت سے پائیے اور پناہ احکام خداوندی میں ڈھونڈیئے۔ نفس کو بے لگام کسی حال میں بھی نہ ہونے دیجئے، اس شورہ پشت گھوڑے سے آپ ذرا بھی غافل ہوئے اور اس نے آپ کو زمین پر دے ٹپکا ———— غصہ اور شہوانیت یہ نفس کے دو بے پناہ حربے ہیں اور انسانیت کے دشمن قاتل، اگر ان پر نوعمری ہی میں قابو پالیا گیا، انہیں عقل اور اس سے بڑھ کر شریعت کے تحت میں لے آیا گیا جب تو خیر ہے ورنہ اگر یہ سنپولے بڑھ کر اژدہے ہو گئے تو کوئی صورت ان کے عذاب سے نجات پانے کی نہ رہے گی۔ سن کے ساتھ ساتھ ان کی گرفت بھی سخت سے سخت تر ہوتی جائے گی۔ انسان خمیازہ اٹھائے گا، پچھتائے گا، جھنجھلائے گا پھر بھی بس پھڑپھڑا کر رہ جائے گا، ان کے پنجے سے رہائی کی کوئی صورت آسان نہ ہوگی۔

(۲) روپیہ کی محبت بھی بڑی بری بلا ہے، سن کے ساتھ ساتھ یہ گھٹتی نہیں بلکہ حرص وہوس عموماً بڑھ ہی جاتی ہے، اور وجہ جواز میں ذہن نئی نئی ضرورتیں گھڑنا شروع کر دیتا ہے۔ ضرورت اس وقت سال پر شروع ہی سے قابو پا لینے اور اپنے کو قناعت کا خوگر بنا لینے کی ہے، یہ جس نے نہ کیا اسے تلخیاں قدم قدم پر پیش آتی رہیں گی، لیکن روپیہ کی محبت اور شئ ہے اور اس کی قدر اور۔ روپیہ کی محبت تو بے شک ہرگز نہ پیدا ہونے پائے لیکن روپیہ کی قدر ضرور ہو، یہ نہ ہوا تو دوسرا مرض اسراف کا پیدا ہو کر رہے گا۔ بخل و اسراف دونوں مرض ایک ہی درجہ کے ہیں اور دونوں بڑے سخت، ان کے حملے سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی واحد صورت یہ ہے کہ قلب کو ایک طرف حب مال سے خالی رکھا جائے اور دوسری طرف روپیہ کی ناقدری سے۔

(۳) دل کو ریا و نمائش سے خالی اور اخلاص سے لبریز رکھنا بھی کوئی آسان و معمولی چیز نہیں، بڑی ریاضت اور بڑے مجاہدوں کے بعد ہی یہ دولت ہاتھ آسکتی ہے اور پھر بھی ہر وقت ڈگمگا جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْحَظٍّ عَظِيْمٍ (اور اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحب نصیب ہوتا ہے۔ حٰم السجدۃ: ۳۵)

ایک بڑا دخل اس میں صدقِ دل سے دعا مانگنے کا ہے اور اسباب و ذرائع شہرت سے اپنے کو دور رکھنے کا ہے۔ نفس عاشق ہے جاہ کا اور انسان ایک حد تک خوشامد پسند طبعاً ہوتا ہے، راہِ اخلاص کا سب سے بڑا راہزن، مداحوں معتقدوں، مریدوں کا گروہ ہوتا ہے، ہر وقت کی داد و تحسین، رضاجوئی حق کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ تفسیر قرآن تک کے بہ ظاہر صوفی صدی

خالص دینی کام کو جب سوچتا ہوں اور اپنے پر جرح کرتا ہوں کہ اگر داد و تحسین، خلق، مسرت نفس اور مالی منفعت وغیرہ سارے خارجی خیالات کو منتزع (الگ) کرلیا جائے، جب بھی یہی اہتمام و انہماک کام کے لئے باقی رہے گا تو ضمیر کچھ کانپ سا اٹھتا ہے۔

(۴) "علم" بہ معنی لکھائی پڑھائی، کتابوں کی ورق گردانی کے شوق کا مرض بچپن سے رہا ہے، اب بھی طالب علم ہی ہوں، ہر وقت اپنے گرد ایک کتب خانہ چاہتا ہوں، بغیر کتابوں کے وقت کاٹنا دشوار ہو جاتا ہے، بارہا شوق مطالعہ کے آگے دوسرے طبعی، جسمانی شوقوں کو مغلوب کرچکا ہوں، لیکن پھر بار بار سوچتا ہوں کہ آخر اس سے ہوتا کیا ہے اور اس سے حاصل کیا؟ جب تک یہ دُھن تمام تر رضائے حق کی خاطر نہ ہو، دنیا میں بالفرض اردو کا نامی مصنف اور گرامی اہلِ قلم کہہ کر پکارا بھی گیا تو حشر میں یہ القاب کیا نفع پہنچائیں گے اور حیاتِ ابدی کے حصول میں یہ کیا کام آئیں گے؟

(۵) بڑے ہی تلخ تجربوں اور خوب ہی ٹھوکریں کھانے کے بعد یہ پُرزور وصیت سارے ناظرین سے ہے کہ دنیا سے دل ہرگز نہ لگائیں اور اس کے مکر و فریب میں نہ آئیں جس کے صدہا چہرے اور بے شمار نقابیں سہی لیکن انسان بہرحال جسم وجد کے ساتھ ہی اس خاکدان میں بھیجا گیا ہے، اس حکمت کی بھی رعایت رکھنا لازمی ہے، دنیا کو برتئے مگر دل نہ لگائیے، دل تو آخرت ہی سے لگائے رہیے، اکبرؔ ہی کے لفظوں میں:

ع غافل نے اِدھر دیکھا، عاقل نے اُدھر دیکھا

دیکھئے! ابھی کتنی اور میعاد کاٹنا ہے، دل تو اسی مژدۂ جاں بخش کے سننے کو تڑپ رہا ہے کہ: اِرْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ۔ (ترجمہ) تو اپنے پروردگار کی

طرف چل خوش ہوتی ہوئی اور خوش کرتی ہوئی، پھر تو میرے (خاص)
بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں جا داخل ہو۔" (الفجر ۲۸ تا ۳۰)

اپنے حق میں تو بس ایک ہی اور آخری دعا یہ ہے کہ بلاوا
اس وقت آئے جب یہ ناکارہ اور آوارہ قلم دین کی خدمت میں
مشغول ہو اور کسی عدو اللہ کے ہفوات کا جواب دے رہا ہو یا اپنے
محبوب کی کسی ادا کی معرفت کی دعوت دے رہا ہو۔"

(آپ بیتی، صفحہ ۳۷۶ تا ۳۸۱)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے عالمِ جذباتِ انسانی، ماہرِ نفسیات، تجربہ کار، زمانہ شناش، نباضِ وقت اور داعی و مصلح کی حیثیت سے سوزِ دروں اور دل کی تڑپ کے ساتھ جو کچھ کہا اور بتایا ہے وہ "رہبرِ زندگی" اور "چراغِ راہ" ہے۔ مولانا دریابادی کی دین و دانش اور ہوش و خرد سے بھرپور باتوں کے پسِ منظر میں میرؔ کا یہ شعر ایک انسان کو "میرِ کارواں" بنانے کے لیے کتنا اونچا پیغام دیتا ہے۔

ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں
یہ کارگاہ ساری دکانِ شیشہ گر ہے

مفتی محمد مصطفیٰ مفتاحی

درود و سلامؐ

بہ آستانۂ رسالت پناہ صلّی اللہ علیہ وسلمؐ

سلام اے محسنِ انسانیّت، اے فضلِ ربّانی
سپہرِ رفعت و عظمت کے اے مہتابِ نورانی

سلام اے آمدِ فصلِ بہاراں، نازِ رعنائی
سلام اے ملّتِ بیضا کے پشتیبانِ بطحائی

سلام اے سیّدِ اولادِ آدم، مشفقِ عالم
سلام اے رحمۃ للعالمینؐ اے ہادیٔ عالم

سلام اے آمنہ کی گود کے لعلِ بدخشانی
سلام اے صورت و سیرت میں اپنا آپ ہی ثانی

سلام اے شافعِ محشر، سلام اے ساقیٔ کوثر
رسالت کے سمندر میں تمہیں یکدانۂ گوہر

سلام اے پستیوں کو تم نے دی تقدیر رفعت کی
تجلّی زار کر دی تم نے وادی تیرہ قسمت کی

سلام اے کہ حبیبِ داورِ گیتی تمہیں تو ہو
سلام اے کہ پناہِ امّتِ عاصی تمہیں تو ہو

سلام اے کہ تمہیں نے شیشہ کو پتھّر سے ٹکرایا
ضلالت کی شبِ ظلمت کو نورِ صبح دکھلایا

سلام اے مشعلِ راہِ ہدیٰ، اے حجّتِ باری
سلام اے کہ تمہاری اک گواہی لاکھ پہ بھاری

سلام اے پیکرِ خُلقِ عظیم و مہرِ دانائی
سلام اے قاسمِ حکمت، نگارِ شانِ یکتائی
سلام اے کہ شکستہ دل کی بس تم ہو مسیحائی
ہدایت نوعِ انساں نے تمہارے در سے ہی پائی

تمہارا اُسوۂ احسن ہماری زیست کا مقصد
تمہیں تو ہو محمدؐ، حامد و محمود اور احمد
تمہاری ہر ادا میں اِنس و جاں کی کامرانی ہے
تمہارا ہی لقب پیغمبرِ آخرِ زمانی ہے

مسلّم ہے تمہاری ہر ادا نگلیا نگِ فطرت ہے
مجسّم نور و نکہت، جانِ الفت، شانِ رحمت ہے
تمہارے دین پر ہر دور میں ہی آندھیاں آئیں
خدا کا شکر! لیکن خود ہی اپنے منہ کی بھی کھائیں

تمہارے آستاں کو چھوڑنا ہے جگ میں رُسوائی
ندامت، واژگوں قسمت، ہزیمت، آبلہ پائی
تمہاری سنّتیں دارین میں وجہِ سکینت ہیں
فرازِ بندگی، سامانِ امن و عیش و عزّت ہیں

سکھاتا ہے تمہارا عشق ہر دم شادماں رہنا
مصائب کے تھپیڑوں میں قوی ہیکل چٹاں رہنا
تمہارا عشق ہے جو مصطفےٰ بے چین رہتا ہے
عطا ہو دیدار ہو جائے، بہت کلفت وہ سہتا ہے

مفکرِ اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں

الحاج محمد شفیع تمنائی پھلواروی

عزمِ بلند میں ترے شاہیں کا حوصلہ

حسنِ صفات و ذات میں اے حسنِ انتخاب
حسنِ دلیل یہ کہ محاسن ترا خطاب

دریائے علم و فن، یمِ عرفاں کے غوطہ زن
اے بحرِ بیکرانِ حقائق کی موجِ آب

اے تیرگیٔ شامِ ضلالت میں نورِ حق
اے روشنیٔ صبحِ ہدایت کے آفتاب

اے جوہرِ خلوص و مروت کے آئینہ
اے گوہرِ محبت و الفت کی آب و تاب

اے رزمِ حریت کے لئے نعرۂ رجز
اے بزمِ منقبت کے لئے نغمۂ رباب

اے مد و جزرِ قلزمِ دانش کی حب و خیر
اے موجِ بحرِ فہم و فراست کے پیچ و تاب

عزمِ بلند میں ترے شاہیں کا حوصلہ
پروازِ فکر تیری پرافشانیٔ عقاب

چینِ جبیں سے تیری زمانہ میں تہلکہ
ہر گردشِ نظر تری اک دورِ انقلاب

حاصل تھیں تجھ کو حضرتِ موسیٰ کی تمکنتیں
فرعون کو تھا عقدۂ مشکل ترا خطاب

آسودۂ غنا و قناعت کے سیر چشم
تھا جامِ جم نظر میں تری کاسۂ حباب

کشکول کی طرح لئے تاجِ شہنشہی
رخ پر ردائے فقر کی ڈالے ہوئے نقاب

حسنِ عمل ترا ہے جمعیت کا انعقاد
خوبیٔ سعی تیری امارت کا انتخاب

رہرو کے ساتھ ساتھ عزیمت کی راہ میں
ہر لغزشِ قدم پہ ترے دل کا اضطراب

افسوس اب وہ روح نہیں جسمِ قوم میں
احساسِ زندگی کا کریں جس سے شیخ و شاب

مشاطگیٔ فکر و تدبر ہی اب نہیں
سلجھائے کون زلفِ سیاست کے پیچ و تاب

تیغِ ستم کے وار سہے سر بکف رہے
سینہ سپر بنا لیا سنگین کا جواب

اہلِ دعا کے حق میں دعا صبح و شام کی
ملت فروش قوم پہ حجت تمام کی

بندوں کے بعد اپنے خدا سے ہے ہم کلام
اور طائرانِ خلد کا نغمہ ہے السلام

پھول کچھ میں نے چنے

خمار کی شاعری — ایک مطالعہ

محمد رضوان القاسمی

دنیا میں جو بھی آتا ہے جانے ہی کے لئے آتا ہے؛ خمار ؔبارہ بنکوی بھی آئے اور چلے گئے، مگر ان کا جانا ان لوگوں کے جانے کی طرح نہیں ہے، جو جانے کے بعد بھلا دئے جاتے ہیں، خمار اردو کے ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے، وہ اردو شعر و ادب کی تاریخ کا ایک حصہ بن چکے ہیں، جب جب یہ تاریخ نگاہوں کے سامنے آئے گی خمار کا نام بھی روشن حرفوں میں آتا رہے گا، کیونکہ خمار کی شاعری کی حیثیت "چراغِ انجمن" کی نہیں، جو ایک شب کا مہماں ہوتا ہے، بلکہ انہوں نے اپنی شاعری سے ایسی "شمعِ دل" روشن کی ہے، جو کبھی جل کر بجھتی نہیں ہے، دیکھئے وہ کیا کہتے ہیں ؎

یہ چراغِ انجمن تو ہیں بس ایک شب کے مہماں
تو جلا وہ شمع اے دل جو بجھے کبھی نہ جل کے

اسی غزل کا مقطع ہے ؎

کوئی اے خمار ان کو مرے شعر نذر کر دے
جو مخالفینِ مخلص، نہیں معترف غزل کے

خمار کی طلب دائمی ہے اور ان کا سفر جاوداں ہے ؎

میری طلب ہے دائمی، میرا سفر ہے جاوداں
منزلِ شوق رہ گئی، مجھ کو خبر نہیں کہاں

اسی غزل کا یہ دوسرا شعر بھی روح کو وجد میں لاتا ہے ؎

؎ ممتاز شاعر حضرت خمار بارہ بنکوی کا انتقال ۲۰ر فروری ۱۹۹۹ء کو اسّی سال کی عمر میں ہوا۔

تازگی و شگفتگی روح میں چھپا ہے نہاں
اہلِ جنوں کے واسطے کیسی بہار کیا خزاں

خمار کا یہی وہ انداز، طرزِ بیان، مزاج کی شگفتگی، ذہن کی تازگی اور جواں عزم و حوصلہ ہے' جس نے انہیں زندگی میں بھی زندہ رکھا ہے اور موت کے بعد بھی وہ تاریخ کے صفحات میں زندہ و تابندہ رہیں گے ؎

بڑھ کے جہادِ عشق میں جان گنوا دے اے خمار
موت کو زندگی بنا، زندگی، زندگی نہیں

زیرِ نظر مضمون کی غرض و غایت خمار کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ نہیں ہے، مگر یہ کہے بغیر آگے بڑھنے کو جی بھی نہیں چاہتا کہ ان کی شاعری میں دریا کی روانی ہے، آبشار کا ترنم ہے، پھول کی مہک ہے، شبنم کی لطافت ہے، موسم برسات کی شادابی ہے، ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہے، سوز بھی ہے اور ساز بھی، گدگدی بھی ہے اور گداز بھی، بابِ انسانیت پر دستک ہے درسِ اخوت ہے، زندگی اور موت پر فلسفیانہ نگاہ ہے، سماج پر کہیں میٹھے اور کہیں تیکھے انداز میں تبصرہ ہے، عشق و محبت کی جلوہ طرازیاں ہیں، واعظ اور ناصح سے چھیڑ چھاڑ ہے، محتسب سے شوخیاں ہیں، مسجد و میخانہ کا تذکرہ ہے، عبادت کی حلاوت ہے' بے ریا سجدہ کی تعریف ہے، اپنے اوپر کبھی نگاہِ ناقدانہ ہے اور کبھی ناصحانہ، عالی حوصلگی کا سبق ہے' یہ نصیحت بھی ہے کہ ہمتِ شوق کو کم نہ کر اور راہِ بقا میں تیز دم اپنے قدم بڑھائے جا۔ کہیں غم کے آنسو ڈھلکتے ہوئے ملتے ہیں، تو کہیں خوشیاں گنگناتی اور رقص کرتی نظر آتی ہیں، اسی لئے مجموعہ کلام کا نام "آتشِ تر" بھی ہے "رقصِ مے" بھی اور "شبِ تاب" بھی۔

کوئی بھی شاعر اور کوئی بھی فلسفی ہو' وہ اپنے دور کے شاعروں اور فلسفیوں سے ضرور متاثر ہوتا ہے، خمار کو دیکھا جائے تو وہ جگر سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں، ان کا یہ تاثر شعری سانچہ میں اس طرح ڈھل کر سامنے آتا ہے ؎

غزل بعدِ جگر اک کشتیِ بے ناخدا سی ہے
اگر طوفان کوئی اے خمار آیا تو کیا ہوگا

خمار کی شاعری میں جگر کا رنگِ تغزل تو ہے ہی، اس کے ساتھ اصغر کا اندازِ بیان بھی ہے میر کا درد بھی، حالی کی سادگی بھی اور حفیظ جالندھری کی نغمگی بھی۔ اس کے باوجود وہ اپنے لب ولہجہ کی ایک شناخت اور پہچان رکھتے ہیں، جس سے شاعری میں ان کا امتیاز اور انفرادیت قائم ہوتی ہے —— خمار کی شاعری کے بارے میں علی سردار جعفری کا یہ تبصرہ بہت خوب ہے:

"غزل جس کا ہر شعر ہوا کے نرم اور لطیف جھونکے کی طرح آئے اور گزر جائے، اور دل میں تازگی کی ایک کیفیت پیدا کر جائے۔ یہ ہے خمار کی شاعری۔ اس میں غزل کی کئی سو برس کی روایات کی تہذیب اور شائستگی ہے، اور سہل بیانی کا ایک ایسا جادو ہے، جو فریب میں مبتلا کر دیتا ہے، یہ یقین کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے کہ ایسا شعر تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں، مگر اقبال اور غالب کے رنگ میں کہنا آسان ہے اور اس رنگ میں کہنا مشکل ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں فکر اور خیال کی اور تشبیہ واستعارہ کی تراش و خراش ایک سرے سے ہے ہی نہیں، جس کی نقل کی جائے، یہ میر اور ان کے ہم عصروں کی روایت ہے، جن کے یہاں خارجی آرائش برائے نام تھی، یہ شاعری شاعر کی اپنی طبیعت کی شگفتگی اور شخصیت کی دل نوازی سے آراستہ ہے اور اس شخصیت کی نقل کرنا منہ چڑانے کے برابر ہے۔" (آتشِ تر، صفحہ ۸، ۷)

اسی سلسلہ میں وہ آگے لکھتے ہیں:

"خمار کے معنوی اور شعری خاندان کا سلسلہ غالب، اقبال اور جوش سے نہیں ملتا، جگر مرادآبادی کا عکس زیادہ ہے، مگر یہ صرف عکس ہی ہے، اصلیت خمار اور ان کی شاعری ہے۔" (آتشِ تر، صفحہ ۱۱)

خمار کا خود اپنے بارے میں جو خیال ہے اسے "بوئے گل در برگِ گل" (پھول کی خوشبو، پھول کی پتیوں میں) کی حیثیت سے پڑھئے:

"میں نے جملہ اصنافِ سخن کا تجزیہ کرنے کے بعد اپنے محسوسات وواردات کے اظہار کے لئے کلاسیکی غزل ہی کو سب سے زیادہ موزوں اور مناسب پایا چنانچہ غزل کے خدمت گزاروں میں شامل ہو گیا، وقت نے کئی کروٹیں بدلیں، مگر میں نے

غزل کا دامن نہیں چھوڑا۔" (رقصِ مئے، صفحہ ۷)

وہ اپنی اس تحریر کے آخر میں لکھتے ہیں :

"آخر میں اتنا عرض کروں گا کہ میں نے غزل کے حسن وجمال میں کوئی اضافہ تو نہیں کیا، مگر اس پُر آشوب دور میں اس کے خدوخال کی آب وتاب کم نہیں ہونے دی"۔ (رقصِ مئے صفحہ ۸)

کلاسیکی غزل کے بے نظیر شاعر اور شہنشاہِ ترنم خمارؔ اب تو کسی مشاعرہ میں اگر نشاط انگیز سوز کے ساتھ اپنی کوئی غزل نہیں سنائیں گے، مگر آئیے ان کے بعد ان کے شعری مجموعوں کے سہارے ان کی "بزمِ شاعری" میں کچھ دیر حاضری دے کر یہ دیکھیں کہ زندہ دل شاعر نے زندہ انسانوں کے لئے مختلف جہتوں اور سمتوں سے اپنے پیارے اور نرالے انداز میں کیا پیغام دیا ہے، اس موقع پر خمار کی اس خوبی کو نہ بھولئے کہ جگر کے نقشِ قدم پر چلنے والے خمارؔ اپنی مئے ناب اور خمار آلود زندگی سے جگر ہی کی طرح تائب ہو کر مئے خانہ سے مسجد کی طرف آنے کی، اللہ والے بننے کی اور عیش وطرب سے منہ موڑ کر متاعِ آخرت حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہو گئے تھے، انہیں اپنی بخشش کی فکر بھی دامن گیر تھی۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے :

حیرت ہے تم کو دیکھ کر مسجد میں اے خمارؔ
کیا بات ہو گئی جو خدا یاد آگیا

قیامت یقیناً قریب آگئی ہے
خمارؔ اب تو مسجد میں جانے لگے ہیں

خمارؔ اب تخلص بھی اپنا بدل دو
بنے ہو جو میکش سے اللہ والے

اے موت! اے بہشتِ سکوں آ، خوش آمدید
ہم زندگی میں پہلے پہل مسکرائے ہیں

خمارؔ کی زندگی میں یہ انقلاب کیوں اور کیسے آیا، ضروری نہیں کہ یہاں ان کی تفصیلات بیان کی جائیں، لیکن یہ انقلاب، بلکہ "صالح انقلاب" ان کے دلِ زندہ اور صفائی ضمیر کی ضرور علامت ہے اور ان کی شاعرانہ عظمت کے ساتھ ان کی یہی زندہ دلی اور صفائی ضمیر میرے قلم

کے لئے محرک بنی کہ وہ کچھ پھول ان کے گلستانِ شاعری سے چنے۔ آئیے اس کی ابتدا اس شعر سے کرتے ہیں ؎

خوفِ خدا نے پاؤں میں زنجیر ڈال دی　　کوئے بتاں میں ٹھوکریں کھانے کے دن گئے

خمار کہتے ہیں کہ عبادت اور بندگی کا کمال یہ ہے کہ جب سجدہ میں جبیں (پیشانی) جھکے تو اس کے ساتھ دل بھی جھکنا چاہئے، اس عابد و زاہد کی حالت قابلِ رحم ہے جو جبیں تو جھکائے، مگر دل جھکا نہ سکے، اس سے ایک رسم تو ادا ہو گی، مگر عبادت کی لذت کو وہ عابد و زاہد پا نہ سکے گا ؎

مجھے تو ان کی عبادت پہ رحم آتا ہے　　جبیں کے ساتھ جو سجدے میں دل جھکا نہ سکے

بارگاہِ الٰہی سے فطری طور پر ایک انسان کو جو اختیار اور آزادی دی گئی ہے اس کا اظہار وہ اپنے مخصوص انداز میں اس طرح کرتے ہیں ؎

آگے جبینِ شوق تجھے اختیار ہے　　یہ دیر ہے، یہ کعبہ ہے، یہ کوئے یار ہے

صوفیانہ رنگ کا یہ شعر بھی خوب ہے ؎

کئے جاتے ہیں سجدے نفعِ جنت کے لئے توبہ!　　عبادت بھی معاذ اللہ، تجارت ہوتی جاتی ہے

سجدہ اور بندگی کا اعلیٰ تصور اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

سر ہے اختیار میں سجدہ وہ سجدہ ہی نہیں　　بندگی اور بقید ہوش، کھیل ہے بندگی نہیں

خمار کہتے ہیں کہ ایک بندہ کا کمال یہ ہے کہ وہ بارگاہِ خداوندی سے ہمیشہ لگا چمٹا رہے اور دستِ طلب بڑھائے رکھے، یہ وہ بارگاہ ہے، جہاں سے انسان خالی ہاتھ نہیں لوٹایا جاتا، ایک مومن اس حقیقت پر یقین رکھتا ہے کہ حریمِ قدس میں دیر تو ہے اندھیر نہیں ؎

دستِ طلب بڑھائے جا، یوں ہی صدا لگائے جا　　اس کے حریمِ قدس میں دیر ہے دھاندلی نہیں

کتنی اونچی سطح سے اونچا تخیل نہایت سادہ زبان اور عام فہم انداز میں دیتے ہیں ؎

مرضیِ دوست میں تجھے دخل دہی روا نہیں　　دل ہو جو مائلِ دعا، ہاتھ اٹھا کے بھول جا

خمار رحمتِ پروردگار کا سہارا اس طرح دلاتے ہیں ؎

اے محتسب عذابِ جہنم بجا مگر　　اک چیز اور رحمتِ پروردگار ہے

اسی موضوع سے متعلق ان کا دوسرا شعر ہے ؎

خطائیں کرتے کرتے توبہ کر لی ہے خمارؔ اکثر　　تڑپ کر رہ گئی ہے رحمتِ پروردگار اکثر

آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے الفت کا اندازہ دیکھئے ؎

خود کو پاتا ہوں بہت آلِ محمدؐ سے قریب　　زندگی جب مری فاقوں میں بسر ہوتی ہے

زندگی اور موت کی حقیقت کو یوں سمجھاتے ہیں ؎

جان دی پروانہ وار اس حسن سے عباسؑ نے　　جینے والے موت ہی کو زندگی کہنے لگے

راہِ حق میں مرنے والے روزِ عاشورہ خمارؔ　　موت سے کھیلا کئے اور زندگی بڑھتی گئی

اگر خمارؔ کے مجموعۂ کلام سے مقصدی اور تعمیری اشعار کا انتخاب مختصر تمہیدی سطروں کے ساتھ بھی پیش کیا جائے تو مضمون خاصا طویل ہو جائے گا، اس لئے چند اہم عنوانات کے تحت ان کے اشعار ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں، یہ اشعار بلا شبہ ذہن و فکر کے دریچوں کو وا کرنے والے، حوصلہ و ہمت بڑھانے والے، امنگ سے سینہ کو لبریز کرنے والے اور زندگی کی حقیقتوں سے پردہ اٹھانے والے ہیں، اشعار پڑھتے جائیے اور نظر کی راہ سے دل میں اتارتے جائیے:

- زندگی

زندگی میں ٹھوکریں بھی کھائیے　　شرط مگر یہ ہے سنبھل جائیے

مانا کہ زندگی فانی ہے لیکن　　اگر آجائے جینا جاوداں ہے

دو دن کی زندگی تھی کہ صدیوں کا تھا سفر　　ہم کیا بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے

- غم اور خوشی

اللہ کے بندے ہیں وہ بھی ہوتی ہے ودیعت جن کو خوشی
وہ چشم و چراغ رحمت ہیں، غم جن کو عطا ہو جاتا ہے

وہ بد نصیب ہیں جنہیں غم ناگوار ہے
غم تو دلیلِ رحمتِ پروردگار ہے

ملنے کو خمارؔ اس دنیا میں ملتے ہیں ہزاروں دوست مگر
اک مخلص تنہا غم کے سوا ہر دوست جدا ہو جاتا ہے

• آدمی اور آدمیت

پھول کر لیں نباہ کانٹوں سے
آدمی ہی نہ آدمی سے ملے

یوں تو ہم زمانے میں کب کسی سے ڈرتے ہیں
آدمی کے مارے ہیں، آدمی سے ڈرتے ہیں

آدمیت بھر رہی ہے سسکیاں
بربریت ہنس رہی ہے آج کل

کاش فرزندانِ آدم سن سکیں
روحِ آدم رو رہی ہے آج کل

سبھی کچھ ہو رہا ہے اس ترقی کے زمانہ میں
مگر یہ کیا غضب ہے آدمی انساں نہیں ہوتا

• سلوکِ اہلِ وطن

سلوکِ اہلِ وطن کی نہ پوچھیے روداد
وطن میں رہ کے بھی رہنا پڑا وطن سے دور

• محدودیت

روشنی محدود ہو جن کی خمارؔ
ان چراغوں کو بجھاتے جائیے

• دوست و دشمن

دشمنوں سے پیار ہوتا جائے گا دوستوں کو آزماتے جائیے

• وفا اور محبت

اس دورِ ترقی میں سبھی کچھ ہے میسر اک چیز محبت ہے کہ پائی نہیں جاتی

اس دور کے انسان وفا بھول گئے ہیں بے چارے فرشتے ہیں خطا بھول گئے ہیں

محبت انتظارِ دائمی کا نام ہے اے دل کوئی آیا تو کیا ہوگا، نہیں آیا تو کیا ہوگا

کانٹے جو بچھائے یہ دنیا گھبرا نہ خمارِ آبلہ پا تبلیغِ محبت کرتا جا، ماحولِ وفا بیزار سہی

• فلسفۂ محبت

بلا کچھ سوچے سمجھے ایک ہو جاتی ہیں دو روحیں محبت اتحادِ ناگہاں معلوم ہوتی ہے

• عشق (وسیع معنیٰ و مفہوم میں)

عشق میں جان بھی دیدی میں نے خمارؔ آج حق زندگی کا ادا ہو گیا

منزلِ عشق سے گزر، بے خود و مست و بے خبر چوٹ لگے تو اف نہ کر دل کو دبا کے بھول جا

عشق ہے تشنگی کا نام، توڑ دے گر ملے بھی جام شدتِ تشنگی نہ دیکھ، لذتِ تشنگی سمجھ

عشق ہے وحدتِ تمام، شرک ہے عشق میں حرام اپنی خوشی خوشی نہ جان اس کی خوشی خوشی سمجھ

• بنامِ دوست

درد اٹھے اٹھا کرے، چوٹ لگے لگا کرے
کچھ بھی ہو تو بنامِ دوست، ہنس کے ہنسا کے بھول جا

• گزرا ہوا زمانہ

گزرے ہوئے زمانہ کو یاد نہ کر کبھی خمار
اور جو یاد آ ہی جائے اشک بہا کے بھول جا

• جھوٹی تسلی

قید رکھا ہمیں صیاد نے کہہ کہہ کے یہی
ابھی آزاد کیا، بس ابھی آزاد کیا

• راہ نما

منزل مرا مقصود ہے، یا دوریِ منزل
یہ بات میرے راہ نما بھول گئے ہیں

• آج کل

زیرِ خنجر ہے اخوت کا گلا
مامتا دم توڑتی ہے آج کل
مانگ سونی ہے دلہن کی ان دنوں
ماں کی گود اجڑی ہوئی ہے آج کل
ہو رہی ہیں عصمتیں نذرِ ہوس
روحِ مریم رو رہی ہے آج کل

• غرور شکنی

طوفان کے غرور جو توڑ کے رہی
اس کشتیِ شکستہ کو میرا سلام ہے

• درسِ مساوات

وہی آنکھ بے بہا ہے، جو غمِ جہاں میں روئے
وہی جامِ جامِ جم ہے جو بغیر فرق چھلکے

• ہمدردی و غم گساری

ڈوبا ہو جب اندھیرے میں ہمسائے کا مکاں
اپنے مکاں میں شمع جلانا گناہ ہے

• نسبتِ چمن

نسبت تو چمن سے رکھتے ہیں ارباب چمن پر بار سہی
پھولوں کو مبارک رعنائی ہم خار اگر ہیں خار سہی

• ربطِ چمن

نشیمن کیا، چمن سے ربط ہونا چاہئے دل کو
نشیمن کے اجڑنے سے چمن ویراں نہیں ہوتا

• گلستاں

اگر ہزار نشیمن جلیں تو فکر نہ کر
یہ فکر کر کہ گلستاں پہ آنچ آنہ سکے

• ربط و تعلق

ہزار ترک تعلق کا اہتمام کیا
مگر جہاں وہ ملے دل نے اپنا کام کیا

ترکِ تعلقات کو مدت ہوئی مگر
دل آج تک خمار اسی رہ گزر میں ہے

بعد ترکِ تعلق یہ کیا ہو گیا
ربط پہلے سے بھی کچھ سوا ہو گیا

ترکِ تعلقات بھی عینِ تعلقات ہے
آگ بجھی ہوئی نہ جان آگ دبی ہوئی سمجھ

• فریبِ زمانہ

پھول بھی جو ہنستے ہیں دل دھڑکنے لگتا ہے
کھائے ہیں فریب اتنے، اب ہنسی سے ڈرتے ہیں

• حوادث

ٹوٹ کر جب تک حوادث آشنا ہوتا نہیں
اور کچھ بھی ہو تو ہو، دل آئینہ ہوتا نہیں

• حفاظتِ دل

حفاظت چاہیئے دل کی، حفاظت چھوڑ گلشن کی
اجڑ جاتا ہے دل، گلشن کبھی ویراں نہیں ہوتا

• عقل اور دل

عقل کے کاروبار میں دل کو بھی رکھ شریکِ کار
دل کے معاملات میں، عقل کو اجنبی سمجھ

عقل و دل اپنی اپنی کہیں جب خمار
عقل کی سنئے، دل کا کہا مانئے

• شمع دل

شمعیں جو بجھیں تو بجھنے دے، دل بجھنے نہ پائے
یہ شمع ہوئی گل تو اجالے نہ رہیں گے

• اھلِ دل

اہلِ زمانہ جس طرح ہنستے ہیں اہلِ دل پہ آج
ہنستے تھے ہم بھی ایسے ہی چند دنوں کی بات ہے

• علم اور جہل

حد سے بڑھے تو علم بھی ہے جہل دوستو
سب کچھ جو جانتے ہیں، وہ کچھ جانتے نہیں

• عزم و حوصلہ

سیلِ حوادث سے نہ گھبرائیے
موجِ رواں بن کے گزر جائیے

راہِ بقا میں تیز دم آگے بڑھائے جا قدم
ہمتِ شوق کر نہ کم، ٹھوکریں کھا کے بھول جا

راہِ وفا سے منہ نہ موڑ، آس نہ توڑ، جی نہ چھوڑ
وہ یوں ہی ظلم ڈھائے جا، تو یوں ہی مسکرائے جا

درد اٹھے تو مسکرا، چوٹ لگے تو دے دعا
ہاں اسی آن بان سے اس کی جفا پہ چھائے جا

دیکھ ٹھہر نہ اے خمارؔ، منزلِ دوست دور ہے
خود کو بھی پیچھے چھوڑتا، آگے قدم بڑھائے جا

خمارِؔ حزیں مسکراتا چلا جا
مصائب کو نیچا دکھاتا چلا جا

قدم فاتحانہ بڑھاتا چلا جا
حوادت کو پیچھے ہٹاتا چلا جا

تمنائیں کانٹے ہیں راہِ وفا میں
یہ کانٹے کنارے ہٹاتا چلا جا

بلا سے اگر عمر کانٹوں میں گزرے
کلی کی طرح مسکراتا چلا جا

فکر کشود و بست کیا، فکر بلند و پست کیا
دغدغۂ شکست کیا، موجِ پُر اضطراب بن

شکستہ دل تو نہیں شکستہ پا ہوں میں
بڑے غرور سے منزل کو دیکھتا ہوں میں

• نعتِ نبویؐ

قیامت میں ہر شخص حیرت زدہ ہے
مرے اشک ہیں دامنِ مصطفےٰؐ ہے

خمارؔ اپنے آقا کو کیا منہ دکھائے
گنہگار ہے سر جھکائے کھڑا ہے

• وصلِ الٰہی

بخش دے یارب اہلِ ہوس کو بہشت
مجھ کو کیا چاہیئے تجھ کو پانے کے بعد

لیجئے، خمارؔ کے گلشنِ شاعری سے کچھ پھول جو ہم نے چنے وہ آپ کے سامنے رکھ دئے، اس

گلشن کی عظمت کے لحاظ سے اسے رنگِ قبول تو حاصل ہونا ہی چاہیئے، تاہم آخر میں اپنی اس خواہش کا اظہار ضرور کرنا چاہوں گا کہ خمار کی شاعری کے جو مجموعے دستیاب ہیں، ان سب کے مطالعہ کے بعد ایک ایسا مجموعہ تیار کرنا چاہیئے جس میں تکرار نہ ہو، اور ایک مجموعہ ہی میں ان کا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام سلیقہ اور ایک خاص ترتیب کے ساتھ عصری کتابت وطباعت سے آراستہ، تمام ظاہری خوبیوں سے مرصّع (جب کہ باطنی خوبیاں پہلے ہی سے موجود ہیں) نگاہِ شوق کی تسکین کا جملہ سامان لئے ہوئے جلوہ گر ہو، بعدِ مرگ خمار کے چاہنے والوں پر خمار کا یہ فرض بھی ہے اور قرض بھی، خمار اردو شعرو ادب کی "بزم رفتہ" اور "عظمتِ ماضی" کے ایسے اہم اور معزز ومحترم رکن ہیں، جنہیں بھلانا شعری اور ادبی بارگاہ میں "گناہ" ہے، بقول خمار ؎

دنیا آج کے بھی کل نہیں رہنے کی اے خمار
ماضی کی عظمتوں کو بھلانا گناہ ہے

"چلنے کے آداب" کا بقیہ :

اور اس کے لئے الگ سے کوئی وقت بھی لگانا نہیں پڑے گا، بلکہ اسی چلنے میں یہ کام بھی پورا ہو جائے گا اور کسی قسم کا کوئی حرج بھی واقع نہیں ہوگا، اس طرح دین ودنیا دونوں میں کامیاب ہوں گے اور یہی ایک مومن کی زندگی کا مقصود اور حاصل ہے، صوفیاء کی اصطلاح میں اسی کو "دست بکار، دل بیار" کہتے ہیں، یعنی ظاہری طور پر ایک مومن دنیا کے کسی کام کو انجام دیتا ہوا نظر آتا ہے، مگر اس کے دل کا ربط وتعلق اپنے خالق ومالک سے رہتا ہے اور زبان تسبیح وتمجید کے کلمات سے تر رہتی ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجادؒ
علمی خدمات و مآثر

خالد سیف اللہ رحمانی

اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی شخصیت کا ایک پہلو نمایاں ہوتا ہے تو زندگی کے دوسرے گوشے نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحبؒ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ مولانا کی قائدانہ صلاحیت اور جذب دروں کا پہلو اتنا نمایاں اور اپنے معاصرین کے درمیان ممتاز اور بے مثال تھا اور ایک مفکر اور مدبر کی حیثیت سے ان کی عبقریت اتنی واضح تھی کہ مولانا کے علمی و فقہی مقام، مجتہدانہ بصیرت اور غیر معمولی ذکاوت و طباعی کی طرف کم توجہ دی گئی۔ مولانا کو اپنے زمانہ کے شہرۂ آفاق اساتذۂ منقولات و معقولات مولانا احمد حسن کانپوریؒ اور حضرت مولانا عبد الکافی صاحب جیسے لوگوں سے استفادہ کا موقعہ ملا اور سترہ اٹھارہ سال تک ابتدائی کتابوں سے لے کر حدیث کی اعلیٰ کتب کی تدریس کا شرف حاصل ہوا، مولانا اصغر حسین صاحب شارحِ آثار السنن نے آپ سے ترمذی شریف پڑھی، مولانا عبد الصمد رحمانی اور مولانا فرخند علی صاحب سہسرامی جیسے محقق علماء آپ کے تلامذہ میں ہیں۔ کثرتِ اسباق کا حال یہ تھا کہ نمازِ فجر سے پہلے سبق کا سلسلہ شروع ہوتا اور عصر کے بعد بھی بعض اہل ذوق ریاضی اور معقولات پڑھتے۔ عربی ادب کے بھی ایسے ذوق شناس تھے کہ ایک ادب شناس کے لیے صرف پندرہ بیس منٹ میں عربی کا ایک بلیغ قصیدہ کہہ دیا۔ (حیاتِ سجاد: ۳۲)

مولانا کا مزاج علم و تحقیق میں تقلید و قناعت کا نہ تھا، بلکہ آپ اخذ و استنتاج کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے، قرآن مجید سے شغف کا حال یہ تھا کہ تفکر فی القرآن کے غلبہ کی وجہ سے گھنٹہ،

آدھ گھنٹہ میں بہ مشکل ایک صفحہ کی تلاوت کرپاتے۔ بہار اسمبلی میں حکومت نے ایک ایسابل پیش کیا تھا جس کے رو سے اوقاف پر زرعی ٹیکس عائد ہوتا تھا، مولانا نے اس کی مؤثر اور کامیاب مخالفت کی، مولانا عبد الصمد صاحبؒ نے دریافت کیا کہ اوقاف پر زرعی ٹیکس کے خلافِ شرع ہونے کی بابت قرآن مجید میں کیا ماخذ ہے؟ مولانا نے یہ آیت پڑھی:

فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَا اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ

کہ جب وصیت میں تبدیلی جائز نہیں، جو مرض الموت میں کی جاتی ہے تو پھر وقف میں بدرجۂ اولی جائز نہیں ہوگی، جو صحت اور طمانینت کی حالت میں کیا جاتا ہے۔ اسی اصول پر "شرط الواقف کالنص" کا ضابطہ ہے۔ سورۂ فاتحہ میں مغضوب اور ضالین سے یہود و نصاریٰ کی جماعت مراد لی گئی ہے، جس کو رات دن نمازوں میں بتیس دفعہ ہر مسلمان پڑھتا ہے اور گویا یہود و نصاریٰ سے براءت کا اظہار کرتا ہے، حالانکہ مشرکین سے بھی اس درجہ براءت کا اظہار نہیں کیا جاتا۔ حضرت مولاناؒ سے اس سلسلہ میں جب دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی نظر میں یہود و نصاریٰ کی جماعتی فطرت یہ ہے کہ ان میں حق کے قبول کرنے کی استعداد نہیں اور مشرکین کی جماعتی فطرت میں حق کے قبول کرنے کی استعداد ہے، چنانچہ یہود و نصاریٰ کے متعلق قرآن نے کہا ہے: لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرۃ: ۱۲)اور مشرکین کے متعلق قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ: وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (القلم: ۹) غور فرمایئے! کتنی بلیغ بات آپ نے فرمائی ہے۔

مولانا کی تحریروں میں احادیث کا بکثرت ذکر ملتا ہے۔ علماء کا نقطۂ نظر تھا کہ ہر حدیث قرآن مجید کی کسی نہ کسی آیت کی تفسیر ہے؛ اسی لیے مولانا کا خیال تھا کہ ہر حدیث کو پڑھاتے ہوئے قرآن سے مربوط کرکے بتانا چاہیے۔

فقہ مولاناؒ کا موضوع خاص تھا؛ جیسا کہ آپ کے فتاویٰ، قضایا اور دوسری تحریروں سے ظاہر ہے۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جیسے محدثین اور اصحابِ علم و فضل آپ کو "فقیہ النفس" کہا کرتے تھے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ سالہا سال سے درس و تدریس اور مطالعہ کا اتفاق نہ ہونے کے باوجود جب بھی آپ سے گفتگو کی جاتی تو علم تازہ نظر آتا۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کا بیان ہے کہ ہماری جماعت میں مشہور ہے کہ زبردست دلائل کے ساتھ کسی بات کو مدلل کرکے بیان کرنا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ کا خاص حصہ ہے، لیکن جماعت کے ذمہ دار ارکان اور میں نے بارہا یہ منظر دیکھا ہے کہ جب کسی مسئلہ پر حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ دلائل و

براہین فقہی کے ساتھ بحث فرماتے تو حضرت مفتی صاحبؒ بھی بے حد متاثر ہوتے اور ان کے علمی تبحر کا اعتراف کرتے ہوئے بے ساختہ ان کی زبان سے کلماتِ تحسین نکل جاتے۔ مولانا فقہ کے غواص اور شریعت کی روح و مقصد کے رمز شناس تھے اور اس کی وجہ سے اخذ و استنباط اور نکتہ سنجی ان کی طبیعت میں تھی۔ مولانا منظور نعمانیؒ نے لکھا ہے کہ لکھنؤ میں مدحِ صحابہ ایجیٹیشن جاری تھا، اسی سلسلہ میں ایک جلسہ میں مردوں کے علاوہ عورتوں کا بھی ایک بڑا مجمع تھا، جب اس مقصد کے لیے گرفتاری پیش کرنے کی بات آئی تو ایک خاتون نے بھی ایک خط صدرِ جلسہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کو لکھا کہ خواتین بھی اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کرنا چاہتی ہیں، مولانا مدنیؒ نے فرمایا کہ ان کی طرف سے اعلان کر دیں کہ جب تک ہم میں سے ایک بھی موجود ہے، یہ گوارا نہیں ہو سکتا کہ آپ اس راہ میں تکلیف اٹھائیں، مولانا نعمانی چلنے لگے تو حضرت مولانا سجاد صاحبؒ نے فرمایا کہ اس کے علاوہ مستورات کو یہ بھی سمجھا دینا کہ حرب سلمی یعنی آئینی جنگ اور تلوار کی جنگ کے احکام شریعت میں جداگانہ ہیں، تلوار کی جنگ میں تو خاص حالات میں عورت کے لیے بھی شرکت کا موقع ہے، مگر یہ آئینی جنگ جس میں اپنے آپ کو گرفتار کرانا ہے، اس میں عورتوں کے لیے شرکت کا کوئی موقعہ نہیں، بلکہ شرعاً ان کے لیے ناجائز ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کے بقول قضاء و امارت اور عشر و خراج وغیرہ جیسے اجتماعی مسائل میں مولاناؒ کو درکِ خاص حاصل تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایک زمانہ میں حزب اللہ کی تحریک کی بنیاد رکھ رہے تھے، قاضی احمد حسین صاحب نے ان کو مولانا کی فکر امارت سے آگاہ کیا، پھر حضرت مولاناؒ کی ملاقات مولانا آزادؒ سے کرائی، اس ملاقات نے مولانا آزادؒ کو ایک نئی سمت سفر سے آگاہ کیا اور پھر مولانا آزاد بھی فکر امارت کے داعیوں اور نقیبوں میں ہو گئے۔

مولانا نہایت ہی اعلیٰ فقہی ذوق کے حامل تھے اور احوالِ زمانہ پر احکامِ فقہیہ کے انطباق میں ید طولیٰ رکھتے تھے، فقہاء کے درمیان جو اختلافِ رائے ہے، مولانا اس اختلاف کو اختلافِ برہان سے زیادہ اختلافِ زمان پر محمول کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ دراصل ماحول اور احوال میں تغیر کی بنیاد پر احکام میں تبدیلی ہے؛ امام ابو حنیفہؒ اور صاحبینؒ کے درمیان جو اختلافِ رائے پایا جاتا ہے، اس کے بارے میں بھی مولانا سجاد صاحبؒ کا یہی نقطۂ نظر تھا؛ اسی لیے مولانا اربابِ افتاء کو ہدایت دیتے تھے کہ وہ امام غزالی کی کتاب سے مصالح مرسلہ کا باب ضرور پڑھیں، تا کہ نئے پیش آمدہ مسائل میں وہ بصیرت کے ساتھ فتویٰ دے سکیں۔

علماء کو نئے دور کے مسائل کا سامنا کرنے کی صلاحیت کے مقصد کے لیے مولانا دینی مدارس کے موجودہ نصابِ تعلیم اور نظامِ درس کو ناکافی تصور کرتے تھے اور اس میں کچھ انقلابی تبدیلیاں چاہتے تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ ہر اہم مدرسہ کے ذمہ ایک مخصوص فن دے دیا جائے، جس کی تکمیل وہاں ہو اور ابتداء ہی سے غیر محسوس طریقہ پر اس کا وہاں ہر درجہ میں لحاظ کیا جائے، کسی مدرسہ کا خاص فن حدیث ہو، کسی کا فقہ، کسی کا قرآن وغیرہ، وغیرہ۔ بہار میں گورنمنٹ کے اثر سے آزاد دینی مدارس کے وفاق کا قیام مولانا کا دیرینہ خواب تھا، جواب ایک درجہ میں شرمندۂ تعبیر ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس میں دوام واستمرار عطا فرمائے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا سجاد صاحبؒ کا نظریۂ تعلیم ایک مستقل موضوع ہے، اس پر لکھنے کی بھی ضرورت ہے اور وفاق المدارس الاسلامیہ بہار کے قیام کے بعد اس بات کا موقعہ فراہم ہو گیا ہے کہ وہ مولانا کے نصب العین کو سامنے رکھ کر مفید تر نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم کا ایک انقلابی عمل شروع کرے۔

آج کل اکثر دینی تحریکات اور اداروں میں بھی کثرتِ رائے اور رائیں مساوی ہوں تو صدر کے ترجیحی ووٹ کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کا طریقہ مروج ہے، جمعیۃ علماءِ ہند کے دستور میں بھی شروع سے یہ بات رکھی گئی ہے، جب جمعیت میں یہ بات زیر بحث آئی کہ کیا عہد نبوی یا عہد صحابہ میں بھی اس کی کوئی نظیر ہے؟ تو مولاناؒ نے فرمایا کہ ہاں اس کی نظیر وہ کمیٹی ہے جس کو حضرت عمرؓ نے خلیفۂ ثالث کے انتخاب کے لیے مقرر کیا تھا اور فرمایا تھا کہ چھ نفری کمیٹی میں سے اکثریت کی رائے پر عمل کرو اور اگر دونوں طرف رائیں برابر ہوں تو حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ جس طرف ہوں ان کی رائے کو ترجیح ہوگی۔ ان واقعات سے مولانا کے ذہن رسا اور فکر بلیغ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مولانا اپنی فقہی مزاج کی وجہ سے قانونی نکتہ سنجیوں سے بھی خوب واقف تھے اور بڑی دقتِ نظر کے ساتھ قانونی موضوعات پر گفتگو کرتے تھے۔ بڑے بڑے دانشور اور قانون داں جب آپ سے گفتگو کرتے تو اپنے آپ کو طفل مکتب محسوس کرتے۔ اسی دسترس کی وجہ سے اکابرِ اہل علم اور اصحابِ نظر کی موجودگی میں تجاویز کی ترتیب کا کام مولاناؒ کو سپرد کیا جاتا اور اکثر مولانا کی گفتگو حرفِ آخر تصور کی جاتی۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مولانا مناظر حسن گیلانیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا عبد الصمد رحمانیؒ، مولانا اصغر حسین صاحبؒ، مولانا مسعود عالم ندویؒ، مولانا محمد منظور نعمانیؒ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا منت اللہ رحمانیؒ، مولانا احمد سعید دہلویؒ مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسے اصحابِ علم ونظر آپ کے علمی مقام، بلوغِ نظر اور بلندی نگاہ کے معترف نظر آتے ہیں۔

اگر مولانا علم و تحقیق ہی کے کاموں کے لیے وقف ہو جاتے تو وہ اپنے زمانہ کے چند گنے چنے اصحابِ علم و نظر میں شمار کیے جاتے، لیکن امت کے درد میں گھلنے والا اور ہر مسلمان کے لیے غم کھانے اور تڑپ اٹھنے والا جو دل اللہ تعالیٰ نے آپ کو ودیعت فرمایا تھا، وہ اس بات کے لیے کیوں کر آمادہ ہو سکتا تھا کہ امت کو بے کسی کی حالت میں چھوڑ کر اور قوم کے سفینہ کو بھنور کی گرفت میں دیکھنے کے باوجود گوشۂ سکون میں بیٹھ جائے اور ساحل پر ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر صرف دادِ تحقیق دینے پر اکتفا کرے؛ اس لیے ہمارے سامنے مولانا کے علمی مآثر اس کمیت اور مقدار کے ساتھ نہیں ہیں جو مولانا جیسی بالغ نگاہ، وسیع النظر اور عمیق الفکر شخصیت سے متوقع تھا، پھر بھی مولانا نے جو کچھ تحریری تبرکات چھوڑے ہیں، وہ ہم جیسے کم سوادوں کے لیے دلیلِ راہ سے کم نہیں۔

فتاویٰ

مولاناؒ کے علمی مآثر میں آپ کے فتاویٰ ہیں۔ ابتداءً امارتِ شرعیہ کا شعبۂ افتاء، پھلواری شریف کے ساتھ ساتھ گیا میں بھی کام کرتا تھا اور مولانا کا قیام بھی گیا ہی میں تھا، اس لیے امید ہے کہ وہاں سے بھی آپ نے سینکڑوں فتاویٰ دیئے ہوں گے، لیکن افسوس کہ ان فتاویٰ کی نقل محفوظ نہیں رہ سکی۔ پھلواری شریف سے آپ کے جو فتاویٰ صادر ہوئے، وہ چند ماہ پہلے حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کے بصیرت افروز حواشی سے آراستہ ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ اس مجموعہ میں ۱۹۸ فتاویٰ ہیں، جو زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ہیں۔ ان میں بعض فتاویٰ نہایت معرکۃ الآراء ہیں۔ علماءِ دیوبند کی تکفیر اور مولانا عبدالکافی الہ آبادی کے نقطۂ نظر سے متعلق فتویٰ جو کتاب کے شروع ہی میں ہے، بہت اہم ہے۔ اجتماعی مسائل نیز امارت و قضاء سے متعلق موضوعات کی بابت جو فتاویٰ اس مجموعہ میں شامل ہیں، وہ علما و اربابِ افتاء کے لیے بہت ہی چشم کشا ہیں۔ ہندوستان میں ایک زمانہ میں انگریزوں کے خلاف "ترکِ موالات" کی تحریک شروع ہوئی تھی، اس سلسلہ میں مولانا عبدالماجد قادری نے ایک استفتاء مرتب کیا ہے، شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب، علماءِ فرنگی محل، علماءِ سہارنپور، علماءِ بدایوں، علماءِ کانپور اور علماءِ دہلی نے اس کے جوابات لکھے ہیں، حضرت مولانا سجاد صاحبؒ نے اس کا تفصیلی اور نہایت بصیرت افروز جواب لکھا ہے، جو ایک طرف آپ کی فقہی بصیرت اور دوسری طرف احوالِ زمانہ سے آگہی کی شاہد عدل ہے؛ چنانچہ آپ کے اس جواب پر ہندوستان کے طول و عرض کے تمام مسالک کے علماء نے تحسین بھی کی ہے اور اس کی تصویب بھی۔ طلاقِ معلق کی ایک صورت کے بارے میں قاضی عبدالحمید صاحب نے ایک استفتاء کیا ہے، جس کا ہندوستان کے مختلف ممتاز علماء

بشمول محمد کفایت اللہؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ نے جواب دیا ہے، جوابات میں تعارض ہے، چنانچہ استفتاء اور یہ جوابات مولانا کے سامنے محاکمہ کے لیے پیش کیا گیا، مولانا نے اس پر اپنی زبردست قوتِ فیصلہ کے ساتھ محاکمہ فرمایا ہے: یہ بھی پڑھنے کے لائق ہے۔

مولاناؒ کے فتاویٰ کا جو امتیازی پہلو ہے، ان میں ایک یہ ہے کہ آپ نے درس گاہ کے حصار میں محدود مفتی کی بجائے سماج و ماحول کے حالات سے واقف صاحبِ بصیرت فقیہ کی حیثیت سے فتاویٰ دیئے ہیں اور بحیثیتِ مجموعی امت کے مصالح کو ملحوظ رکھا ہے۔ مدارسِ اسلامیہ میں سرکاری اوقاف سے مدد لینے کے بارے میں آپ نے فتویٰ دیا ہے کہ اگر اندیشہ ہو کہ اربابِ حکومت خواہ مخواہ دخل دیں گی، اس کی وجہ سے تعلیم میں نقص اور اظہارِ حق میں کوتاہی کرنے پڑے گی، تو ایسی صورت میں مدد لینی جائز نہیں ہوگی۔ (ص: ۲۲۱) آج بہار اکزامینیشن بورڈ کے نصابِ تعلیم اور معیارِ تعلیم کو سامنے رکھا جائے تو مولاناؒ کا یہ فتویٰ نوشتۂ دیوار معلوم ہوتا ہے۔ غیر مسلموں سے تعمیر مساجد میں مالی تعاون لینے کی بابت مولاناؒ کی رائے عدم جواز کی ہے، ہاں یہ صورت آپ کے نزدیک جائز ہے کہ غیر مسلم نے مسلمان کو کوئی چیز ذاتی طور پر ہبہ کی ہو اور مسلمان اسے تعمیر مسجد میں صرف کردے۔ (ص: ۲۱۱) وجہ اس کی ظاہر ہے کہ غیر مسلموں کے چندہ میں احتیاط نہ برتی جائے تو اندیشہ ہے کہ کل ہو کر وہ بھی اپنی عبادت گاہوں کے لیے مسلمانوں کو تعاون پر مجبور کریں۔

مسجد کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کے بارے میں بھی مولانا کا فتویٰ بہت واضح اور بے لچک ہے (دیکھئے: ص: ۲۰۸، ۲۰۹) کیوں کہ اس مسئلہ میں ذرا بھی نرم روی بہت بڑے فتنہ اور شعائر اسلام کی بے حرمتی کا پیش خیمہ ہے۔ بہت سے دیہات اور قریہ جات وہ ہیں جہاں نمازِ جمعہ ہی لوگوں کے اسلام سے وابستگی اور تعلق کا اثاثہ ہے اور اسی سے ان کی پہچان باقی ہے، اس لیے فقہی موشگافیوں سے قطع نظر ایک دردمند داعی کی نگاہ سے مولاناؒ اس مسئلہ کو دیکھتے تھے اور ایسے گاؤں میں نمازِ جمعہ کے جواز کا فتویٰ دیتے تھے جہاں مسلمانوں کی مستقل آبادی ہو اور جماعت کے لیے مطلوب بالغ مرد موجود ہوں۔ (۲: ۵۱ تا ۵۹) مسلمانوں کو اسلام پر باقی رکھنے کے لیے موجودہ حالات میں یہ فتویٰ کتنی اہمیت رکھتا ہے، وہ محتاجِ اظہار نہیں۔ مولانا غیر عربی زبان میں خطبہ کے جواز کے قائل نہیں تھے۔ اس کے لیے فقہی دلائل تو پیش کرتے ہی تھے لیکن نگاہِ دوررس اثر کے سامنے یہ حقیقت بھی تھی کہ ”جن وجوہ کی بناء پر لوگ خطبہ کو اردو میں پسند کرتے ہیں، انہیں وجوہ کی بناء پر ترکوں نے نماز میں قرآن مجید کو بزبانِ ترکی پڑھنا چاہا اور روک دیئے گئے، شاید اگر یہی لیل و نہار رہے تو ہندوستان میں بھی کم از کم نمازِ جہری میں تو ضرور امام سے اردو میں قرآن پڑھنے کی خواہش ہوگی۔“ (ص: ۶۱)

سماجی اصلاح کا ایک موثر ذریعہ مالی جرمانہ ہے اور ہندوستان جیسے حالات میں جہاں جرم و سزا کا قانون مسلمانوں کی دائرۂ اختیار میں نہیں آسکتا، سماجی اصلاح اور مفاہمت بین الناس کا یہ ایک موثر ذریعہ ہے، چنانچہ مولانا نے اس کی اجازت دی ہے، البتہ چوں کہ فقہاء نے اس کو منع کیا ہے، اس لیے یہ پیرایہ اختیار کیا ہے کہ جرمانہ بہ طورِ صدقۂ نافلہ وصول کیا جائے، تاکہ نقصانِ مالی کے خیال سے "نفس امارہ" آئندہ گناہ پر جرأت نہ کرے۔ (ص: ۲۹۰،۲۵۸)

مولانا کے فتاویٰ میں ان کا داعیانہ رنگ ہر جگہ نمایاں ہے، کہ محض مسائل کی رہنمائی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ مناسبِ حال تذکیر بھی کرتے ہیں اور اصلاح کے وسائل کی بھی رہنمائی کرتے ہیں۔ طلاق کے ایک مسئلہ میں مولاناؒ نے برادری کے لوگوں کو متوجہ کیا کہ وہ شوہر کو........ طلاق دینے پر مجبور کریں، تاکہ عورت کی دادرسی ہو سکے۔ زنا اور اس سے ثبوتِ نسب سے متعلق ایک سوال وجواب میں مولاناؒ نے لکھا ہے کہ "پنچایت کو چاہیے کہ بکر اور اس عورت کو ایسی تنبیہ کریں کہ جس سے آئندہ کے لیے بھی وہ ڈرتے رہیں اور ان کی برادری کے دوسروں لوگوں کو بھی عبرت ہو۔ (ص: ۲۹۰) ایک سوال عصمت فروش عورتوں کے یہاں میلاد میں جانے سے متعلق ہے، مولانا اس کی کمائی اور شیرینی وغیرہ کو تو ناجائز قرار دیا ہے، لیکن یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ: "اگر کوئی حافظ اور مولوی اس کے یہاں محفل میلاد میں محض اس وجہ سے جائے کہ وہ اس بدکار عورت کو خدا اور رسول کا خوف دلائے اور توبہ کرنے کی ترغیب دے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ (ص: ۲۴۵) بیوی کو ماں یا بہن کہنے کا کیا حکم ہے؟ اس کا فقہی جواب دینے کے بعد فرماتے ہیں: "زید اپنی تنبیہ کے لیے اپنے نفس پر کوئی ایسا صدقہ دینا لازم کر لے جو اس کے نفس پر کسی قدر بار ہو، تاکہ اس کے ذریعہ ہمیشہ اس اثر کو یاد رکھے کہ ایسے کلمات کہنا خلافِ شریعت ہے اور ہمیشہ اس سے بچتا رہے۔" (ص: ۱۶۸)

مولانا کے فتاویٰ کا ایک امتیازی پہلو مسلمانوں کو فتنہ وانتشار سے بچانے کی کوشش بھی ہے، بعض مواقع پر محض حق کا اظہار اور مسائل کا بیان کر دینا کافی نہیں ہوتا کہ کبھی کبھی اس سے نزاع و انتشار کی صورت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مولانا اپنے فتاویٰ میں اس بات کا خوب لحاظ رکھتے تھے۔ انگریزوں کے زمانے میں انگریزی اخبارات کے ذریعہ یہ بات پھیلائی گئی تھی کہ والیِ کابل کی بیوی نے صدرِ فرانس سے ہاتھ ملایا، اس خبر اور تصویر کی اشاعت کا مقصد ہندوستان کے مسلمانوں کو امان اللہ خاں سے بدگمان کرنا تھا، مولاناؒ نے اس سلسلہ میں استفتاء کا جواب لکھتے ہوئے پہلے تو غیر محرم مرد سے ہاتھ ملانے کا شرعی حکم بیان کیا، پھر تحریر فرمایا: "لیکن اہلیہ غازی امان اللہ خاں بادشاہِ کابل سے

متعلق جو واقعہ آپ نے لکھا یہ تصدیق طلب ہے ،بغیر کامل تصدیق کے اخباری خبروں و تصویروں پر اعتماد کر کے کوئی رائے قائم کرنا شرعاً درست نہیں۔" (ص : ۲۴۷) ایک جگہ پنچ نے چھوٹی بہن سے بڑی بہن کو سود دلوایا، اس کے جواب میں حضرت امیر شریعت ثانیؒ نے اس کی مذمت و شناعت پر مبنی جواب دیا، مولاناؒ نے اس جواب پر ایک تحریر کا اضافہ کیا، جس میں اس کی مزید تاکید کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ :"اگر خدانخواستہ پنچ اور بڑی بہن راضی نہ ہوں اور سود کا روپیہ واپس نہ ہو تو اس کی وجہ سے کوئی جدید فتنہ برپا نہیں کرنا چاہیے۔" (ص :۲۱۱) اسی طرح ایک مقام پر ایک مسجد سے قریب ہی دوسری مسجد کی تعمیر کے بارے میں دریافت کیا گیا، مولانا نے اپنے فتویٰ میں بلاضرورت دوسری مسجد کی تعمیر سے منع فرمایا، لیکن یہ بھی فرمایا کہ اگر وہ لوگ اس پر مصر ہوں تو اختلاف نہ بڑھایا جائے ، جس سے جو مسجد قریب ہو وہ وہاں نماز ادا کیا کریں۔

غیرتِ ایمانی اور حمیتِ اسلامی مولاناؒ کا سب سے بڑا امتیاز تھا اور وہ اس کو تمام علائق سے بالاتر رکھتے تھے۔ فتاویٰ میں بھی مولانا کا یہ رنگ پوری طرح عیاں ہے اور اس معاملہ میں آپ کے یہاں کوئی لچک نہیں۔ ذبح گاؤ کے مسئلہ میں بعض اہل علم نرم رویہ رکھتے تھے اور آزادی سے پہلے مسلم لیگ نے تو ایک تجویز ہی پاس کر دی تھی کہ مسلمان ذبح گاؤ سے رک کر ہندو بھائیوں کے جذبات کا احترام کریں، لیکن مولاناؒ اس مسئلہ میں کسی مداہنت کے روادار نہیں تھے ؛ چنانچہ جمعیۃ علماء بہار کے اجلاس دربھنگہ ۱۳۳۹ھ میں مولاناؒ نے ایک فتویٰ مرتب فرمایا، جس پر بہار کے سربر آوردہ علماءِ کرام نے اپنے دستخط ثبت فرمائے اور مولاناؒ نے اس کو علماءِ بہار کا متفقہ فتویٰ کے نام سے شائع فرمایا۔ اس میں آپ نے قشقہ لگانے ، ہندوؤں کے مراسم مذہبی میں شریک ہونے ، کنٹھا باندھنے اور ہندوؤں کے جذبہ گاؤ پرستی کی رعایت کرتے ہوئے ذبح گاؤ سے پرہیز کرنے کو ناجائز اور حرام قرار دیا اور ان چیزوں کو بہتر اور جائز سمجھنے کو تائید علی الشرک ہونے کی بنا پر باعث کفر قرار دیا۔ (ص :۸۸-۲۸۷) گورنمنٹ کی جانب سے اس طرح کی پابندی عائد کرنی کی کوشش کی گئی کہ وہ ایک مخصوص مقام پر ہی قربانی کر سکتے ہیں، دوسری جگہوں پر قربانی کی اجازت نہیں، مولاناؒ نے اپنے فتویٰ میں ہدایت فرمائی کہ مسلمان ایسی قیود کو ہرگز قبول نہ کریں، لیکن حسن تدبیر کو ملحوظ رکھیں اور مولانا کے الفاظ میں "دفع ضرر اور جلب منفعت کا" کا لحاظ کر کے کام کرنا چاہیے" غیر مسلموں کے مشرکانہ میلہ جیسے دسہرہ وغیرہ میں شرکت سے بھی مولانا نے سختی سے منع فرمایا اور مستفتیوں سے خواہش کی ہے کہ مسلمان خود اپنے انتظام سے کوئی بازار لگائیں جس میں کوئی ناجائز کام نہ ہو۔ (ص :۱۳۶)

انگریزوں کا عہد استبداد ہے، لیکن مولانا کا فتویٰ بالکل واضح ہے کہ جو لوگ بہ رضا و رغبت حکومت کے ملازم ہیں اور حکم شریعت کا پرواہ کیے بغیر حکومت کا ہر حکم بجالاتے ہیں، ان کو امام نہیں بنانا چاہیے، البتہ اگر ان کے پیچھے نماز پڑھ لی جائے تو نماز ادا ہو جائے گی۔ ویران مساجد کے بارے میں بھی آپؒ کی رائے بالکل واضح اور بے لچک تھی کہ وہ قیامت تک کے لیے مسجد ہے اور حسب طاقت و استطاعت مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان مسجدوں کو واپس لے کر آباد کریں، ورنہ سخت گنہ گار ہوں گے۔ مولانا نے اپنے بعض فتاویٰ میں انگریزی عدالتوں کے فیصلوں کو غیر معتبر کہنے میں کسی حیلہ و تعریض سے کام نہیں لیا ہے۔ (دیکھئے : ص : ۱۹۴) اور متعدد مواقع پر متنبہ کیا ہے کہ انگریزی عدالتوں میں ایسے مقدمات کا لے جانا سخت معیوب ہے۔ : ص : ۲۰۰)

جو مسائل حلال و حرام سے متعلقہ ہیں، ان میں مولاناؒ کے یہاں بڑی احتیاط ہے۔ بیع بالوفا کا مسئلہ جس میں بعض فقہاء نے تعامل کی بنا پر کسی قدر نرمی برتی ہے، مولاناؒ نے اس کو معاملۂ فاسدہ ہی قرار دیا ہے، (ص : ۲۳۰) عیدگاہ کی زمین پر مدرسہ یا دارالطلبہ بنانے کی اجازت آپ نے نہیں دی ہے، کیوں کہ منشأ واقف کی خلاف ورزی ہے، مسجد کے صحن میں انگریزی تعلیم سے آپؒ نے ماحول کے پس منظر میں منع فرمایا، کیوں کہ بقولِ مولانا "انگریزی تعلیم محض دنیا طلبی کے لیے ہے، اس لیے مسجد کے صحن میں تو قطعاً نہیں پڑھانا چاہیے"، (ص : ۲۱۹) مولاناؒ نے عام حالات میں بینک میں روپیہ رکھنے سے منع کیا ہے اور کاروبار یا دیگر ضرورتوں سے بھی قرض لینے سے بھی منع کیا ہے۔ بینک کے سود کے بارے میں مولانا کے فتاویٰ متعارض ہیں، بعض فتاویٰ میں آپ نے بینک کے سود کو جائز قرار دیا ہے اور مولانا کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ رقم چونکہ کافر سے ایک معاہدہ کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، اس لیے یہ فئ کے حکم میں ہے اور مسلمانوں کے لیے جائز ہے (ص : ۲۳۳، ۳۴) لیکن ایک فتویٰ میں آپ نے دارالحرب میں بھی سود کو حرام قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ قول احوط ہے، (ص : ۲۳۲) لیکن ظاہر ہے کہ یہ فتویٰ برطانوی عہد سے متعلق ہے، نہ کہ موجودہ جمہوری دور سے؛ چنانچہ مولانا ایک فتویٰ میں رقمطراز ہیں :

ہندوستان ہمارے نزدیک حکومتِ انگلیشیہ کے کامل تسلط کے وقت سے دارالحرب ہے۔

اس احتیاط کے باوجود ایسا تشدد بھی نہ تھا کہ زمانہ کے واقعی ضروریات کو بھی نظر انداز کر دیں، آپ کے فتاویٰ میں احوالِ زمانہ کی حسب موقعہ رعایت بھی ہے۔ استبدالِ وقف کے مسئلہ میں قاضی شریعت کے اذن سے جواز رجحان ہے۔ (ص : ۲۰۲) اگر مسجد کے سامنے قبر ہو اور اس کے کچھ اوپر سے چھت ڈال دی جائے، مولاناؒ نے اس صورت کو متولی یا وارث کی اجازت سے درست قرار دیا ہے

اور فرمایا ہے کہ اس میں نماز ادا کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ (ص : ۲۱۵) تجارت میں آج کل کمیشن ایجنٹ کی صورت بہت شائع ذائع ہے، مولانا کا رجحان اس کے جواز کی طرف ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اصول و قواعد پر جتنی نظر ہوگی، نگاہ میں وسعت پیدا ہوگی اور رائے میں توازن ہوگا اور جزئیات پر انحصار و قناعت سے تنگی فکر بھی پیدا ہوتی ہے اور بعض اوقات آدمی کی رائے غیر متوازن ہو جاتی ہے۔ مولاناؒ کے فتاویٰ اور دوسری تحریروں سے یہ بات عیاں ہے کہ آپ مسائل کے حل میں زیادہ تر اصول و قواعد کو پیش نظر رکھتے تھے، آپ کے فتاویٰ میں بھی جا بجا یہ رنگ موجود ہے، مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں: عبادات میں وہی کام کرنا چاہیے جو حدیث و فقہ سے ثابت ہو (ص : ۴۲) ایک فتویٰ میں رقم طراز ہیں کہ "قرض میں سود کی شرط شرط فاسد ہے (۲ : ۲۳۲) ایک اور فتوے میں فرماتے ہیں کہ تبدیلیٔ اسم سے مسمی کی حقیقت نہیں بدلتی۔

خطبۂ صدارت

مولانا کے علمی مآثر میں آپ کا وہ خطبۂ صدارت ہے جو آپ نے اجلاس جمعیۃ علماء ہند منعقدہ مراد آباد میں تحریری طور پر پیش کیا تھا۔ یہ نہایت عالمانہ، بصیرت افروز اور موثر خطبہ ہے۔ یہ ایک طرف آپ کے مطالعہ کی وسعت اور علمی گہرائی کا شاہد ہے، دوسری طرف اپنے عہد اور حالات پر آپ کی گہری نگاہ کا ثبوت اور ساتھ ہی ساتھ امت کی مصیبت پر تڑپ اور درد و اضطراب کا آئینہ دار۔ یہ خطبہ ایک سو دو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس خطبہ میں آپ نے خلافتِ اسلامیہ کے مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے، اس زمانہ میں خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کا واقعہ پیش آیا تھا اور یورپ سمجھتا تھا کہ اب اسلام کا چل چلاؤ ہے، چنانچہ خلافتِ عثمانیہ کے سقوط پر اظہارِ افسوس کے ساتھ ساتھ آپ نے یہ بات بھی واضح فرمائی ہے کہ خلافت کا خاتمہ خدانخواستہ اسلام کے خاتمہ کا پیش خیمہ نہیں، کیوں کہ ۶۵۶ھ تا ۶۵۹ھ کے عرصہ میں بھی عالم اسلام میں خلافت کا وجود نہیں تھا اور اسلام کی شان و بان اس کے باوجود باقی رہی، ترک الغاءِ حکوت کے لیے جو اعذار بیان کرتے تھے، مولاناؒ نے نمبر وار ان کا ذکر کیا ہے اور ایک ایک کر کے ان کا مدلل رد فرمایا ہے، پھر یہ واضح فرمایا ہے کہ اصل میں الغاءِ خلافت کے اسباب کیا ہیں۔ مولاناؒ کے خیال میں اس کے تین بنیادی اسباب ہیں: اول یہ کہ اسلام میں حریت اور آزادی کا تصور یورپ سے مختلف ہے، یورپ نے اس لفظ کا سہارا لے کر مسلمانوں کو دھوکہ دیا اور مسلمانوں نے بھی محض لفظ اور تعبیر کے اشتراک کی وجہ سے سمجھ لیا کہ یہی حریت اسلام میں بھی مطلوب ہے، حالانکہ مولانا کے الفاظ میں:

"اسلامی حریت، حریت مطلقہ نہیں، بلکہ مقیدہ ہے اور حریت مفرطہ نہیں بلکہ حریت عادلہ معتدلہ ہے اور مسلمان انسانوں کی غلامی سے بالکلیہ آزاد ہونے کے باوجود سر سے پاؤں تک اس دنیا میں قوانین الٰہی کی زنجیروں میں ایسا جکڑا ہوا ہے کہ ان زنجیروں کو توڑ کر وہ آزاد نہیں ہو سکتا، بلکہ انہیں زنجیروں میں جکڑ بند رہنے کے ساتھ تمام خود ساختہ پرداختہ انسانی غلامی سے آزاد ہے اور بالکل آزاد ہے۔"

دوسرا سبب مولاناؒ کے الفاظ میں جمہوریتِ فاسدہ کا تعاون ہے اور اس میں بھی یہی ہوا کہ فرانسیسی جمہوریت اور اسلام کے جمہوری اور شورائی نظام کے فرق کو سمجھا نہ جا سکا اور تیسرا سبب وطنیت کی بنیاد پر قومیت کی تعمیر ہے اور مولاناؒ کے بقول: "اسلامی قومیت کی تعمیر صرف کلمۂ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" اور اصولِ اسلام کی تسلیم اور انقیاد پر ہے اور یہی اسلامی قومیت حدودِ جغرافیہ سے بالاتر ہے، وطنیت کے جذبہ کا یقیناً آخری یہی اثر و نتیجہ ہوگا کہ مختلف ممالک کے مسلمان ایک دوسرے سے بے نیاز ہو کر اس وطن پرستی میں مشغول ہو جائیں گے جو یقیناً اتحادِ عالم اور اسلامی مرکزیت کو ہمیشہ کے لیے ناممکن بنا دے گا، اس کے بعد مغربی گرگے ایک ایک کر کے ہر ایک کو نگلنا شروع کر دیں گے۔"

مولاناؒ نے اس خطبہ میں علماء سے گلہ کیا ہے کہ فقہاء نے آدابِ قضا و سیر، کتاب البیوع اور علم الکلام کے فصل امامت میں سیاست مدن سے متعلق بہت سے اصولی اور فروعی احکام ذکر کیے ہیں، لیکن کتاب الطہارۃ، کتاب الصلاۃ اور نکاح و طلاق کے ابواب میں جس طرح بال کی کھال نکالی گئی ہے، نظامِ اسلام کے اصول و فروع میں اس تفصیل سے کام نہیں لیا گیا ہے، قرآن نے اقامت صلاۃ، ایتاءِ زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو تمکین فی الارض کا ثمرہ قرار دیا ہے، لیکن "تمکین فی الارض" کی نسبت سے قرآن و سنت اور خلفاء راشدین کے اسوہ کی جو رہنمائی ہے، اس سے اعتناءِ کامل نہیں کیا گیا ہے۔ مولانا کی رائے ہے کہ اصولِ نظامِ اسلام کے علاوہ اب اس کی بھی ضرورت ہے کہ "نظامِ اسلام" اور مروجہ نظام ہائے جمہویت دنیا" کے مابین مابہ الافتراق امور کو نہایت وضاحت سے ظاہر کیا جائے اور پھر نظامِ اسلام کے تفوق کو نمایاں طور پر واضح کر دیا جائے۔

مولاناؒ کو علماء سے شکایت ہے کہ جیسے علمی اعتبار سے سیاست مدن اور اجتماعی زندگی کے ابواب سے بے اعتنائی برتی گئی، اسی طرح علماء نے عملی حیثیت سے بھی سیاست سے دوری اختیار کی اور خلفاءِ راشدین کے بعد سے ہمیشہ سے اس باب میں کمی ہی ہوتی رہی۔ مولاناؒ نے سیاستِ عادلہ اور سیاستِ ظالمہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے واضح فرمایا کہ سیاست عین دین ہے اور حدیث کے الفاظ: "تسوسھم الانبیاء" سے واضح ہے کہ یہ انبیاء کا طریقہ ہے، پھر مولاناؒ نے سلف صالحین میں ان

فقہاء کا ذکر کیا ہے جو ایک طرف علم اور تفقہ میں اوجِ کمال کو پہنچے ہوئے تھے اور دوسری طرف حکومت کے اعلیٰ سیاسی عہدوں پر بھی فائز المرام تھے۔ مولاناؒ نے اس سلسلہ میں علامہ محمود بن مظفر مروزی، علامہ عیسیٰ بن محمد ہکاری، قاضی القضاۃ تقی الدین بن عبد الوہاب علائی، علامہ محمد بن حسین انصاریؒ قاضی القضاۃ علامہ تاج الدین ابن عبد الوہاب کا ذکر فرمایا ہے، پھر مولانا نے اقامت وخلافت کے سلسلہ میں مسلمانانِ ہند اور علماءِ ہند کو متوجہ کیا ہے۔ مولاناؒ نے اس ضمن میں نظام اسلام پر ایک مکمل اور جامع کتاب کی ترتیب کا مشورہ دیا ہے، جو صرف فقہاء ومحدثین اور متکلمین ہی کے اقوال پر مبنی نہ ہو، بلکہ مدارک حکم اور اصول استصلاح کو ملحوظ رکھ کے مرتب کی جائے۔ مولاناؒ نے مسئلۂ استصلاح پر بھی ایک مستقل رسالہ کی ترتیب کا مشورہ دیا ہے، جو مصلحت کے مدارج اور مصالح کے اعتبار کے اصول کو واضح کرتا ہو۔ مولاناؒ نے اپنے اس خطبہ میں اس بات پر خاص طور سے زور دیا ہے کہ جزیرۃ العرب کو غیر مسلم اثر سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ومامون بنادیا جائے، کہ یہ بہت ہی ضروری ہے۔

اس خطبہ میں اس زمانہ میں حجاز میں شریف حسین اور اہل نجد کے درمیان جو معرکہ آرائیاں ہوئیں، ان کا بھی تفصیلی تذکرہ ہے۔ ترکِ موالات کے مسئلہ پر بھی تفصیلی بحث کی گئی ہے اور موالات کی مختلف قسمیں اور ان کے احکام پر فقیہانہ روشنی ڈالی گئی ہے اور کفار محاربین اور کفار غیر محاربین کا فرق واضح کیا گیا ہے۔ مولاناؒ نے اس ذیل میں اختلافِ احوال کی وجہ سے تبدیلیٔ احکام پر بھی بحث کی ہے اور خوب کہا ہے کہ دراصل حکم شرعی نہیں بدلتا، بلکہ: "حکم شرعی کا محل بدل جاتا ہے اور جب وہ محل نہیں رہا تو اس کا جو حکم تھا وہ حکم بھی نہیں رہا۔" مولاناؒ نے اسی مسئلہ کے تحت "أھون البلیتین" پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، پھر ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اس بات کو بھی منقح کیا ہے کہ غیر مسلموں سے ہدنہ، صلح اور موادعت کی کیا صورت ہونی چاہیے اور مسلمانوں کو اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ صلح وآشتی بھی ایسی نہ ہو کہ وہ کفر وشرک تک پہنچادے۔

مولاناؒ نے امام غزالیؒ کی "میزان العلم و العمل" کے حوالہ سے یہ نکتہ بھی آشکارا کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے "شیّبتنی الھود" (سورۂ ھود نے مجھے بوڑھا کردیا) کی وجہ اس سورۃ میں شدائد قیامت، امم ماضیہ کا ذکر نہیں، بلکہ "فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ" کا حکم ہے، پھر مولانا نے مسلمانوں کو استقامت کی دعوت دی ہے اور نہایت ہی دردمندانہ اور عالمانہ انداز پر اتحادِ ملت اور اتحادِ علماء کی طرف متوجہ کیا ہے۔ مولاناؒ نے اس خطبہ کے اخیر میں امارتِ شرعیہ فی الہند کے قیام کی دیرینہ آرزو کو دہرایا ہے اور اس فریضہ کی طرف علماء کو متوجہ کیا ہے، پھر نظام امارت کا پورا خاکہ تحریر

فرمایا ہے اور اخیر میں حضراتِ علماء کو ان الفاظ سے متوجہ کیا ہے :

"یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ میں جس نظام کی دعوت دے رہا ہوں اس سے مقصود شخصیت پرستی ہے، بلکہ میں وحدت پرستی کی دعوت دیتا ہوں اور یہ کہتا ہوں کہ جس طرح شخصیت ملعونہ کے قلادہ کو نکال پھینکئے، اسی طرح جمہوریت منحرفہ کے طوق کاٹ ڈالئے اور اس سنت سنیہ کو اختیار کیجئے، جس کی اتباع میں دارین کی فلاح ہے اور سنت سنیہ کی راہ وہی ہے جس کا ادنیٰ خاکہ میں نے پیش کیا ہے اور اگر مسح خفین کا مسئلہ حسب بیان بعض صحابی قرآن میں موجود ہے تو میرا یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ نظامِ اسلام کا وہ خاکہ بھی جو میں نے پیش کیا ہے یا جمعیۃ علماء کے سامنے ہے، قرآن میں موجود ہے، لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ، و قال رسول الله صلی الله علیه وسلم : علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین المهدیین و عضوا علیها بالنواجذ ."

حقیقت یہ ہے کہ مولاناؒ کا یہ خطبہ نہایت عظیم الشان، بصیرت افروز اور چشم کشا خطبہ ہے اور اس لائق ہے کہ تمام مسلمان اور خاص کر علماء اور قائدین ضرور اس کا مطالعہ کریں، کہ شکوک و شبہات کی کتنی ہی گرہیں ہیں جو اس خطبہ سے کھلتی ہیں اور فکر و نظر کی کتنی سمتیں ہیں جو اس خطبہ سے وا ہوتی ہیں۔

حکومت الٰہی

مولاناؒ نے خطبۂ صدارت مراد آباد میں نظامِ اسلام پر جس کتاب کی ضرورت کا اظہار فرمایا ہے اور اس مفصل و مبسوط اور جامع کتاب کا جو خاکہ آپ کے ذہن میں تھا، یہ کتاب اسی کی تمہید اور اس کا لُب لباب ہے؛ اسی لیے یہ کتاب صرف ایک باب پر مشتمل ہے۔ نہ معلوم اور کتنے ابواب کا خاکہ مولاناؒ کے ذہن میں تھا۔ اس مفصل کتاب کے لیے متفرق نوٹس آپ نے رکھا تھا۔ اب اس کی ترتیب و تدوین کا مرحلہ تھا۔ اسی سلسلہ میں پہی تمہیدی باب پورا ہوا اور لکھنے والے نے دل و دماغ کی اس امانت کو قلم کے سپرد کرنے سے پہلے ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں بے آمیز طریقہ پر حکومت الٰہیہ قائم ہے۔ حضرت امیر شریعت رابع مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ نے ۱۹۴۱ء میں اسے طبع فرمایا۔ مولانا رحمانیؒ نے اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ "حکومت الٰہیہ کے نظام کی تفصیلات مولاناؒ کے جمع کردہ نوٹس میں موجود و محفوظ ہے، اگرچہ ان کی ترتیب و تبویب کا کام آسان نہیں، لیکن کوشش کی جائے گی کہ اس کو مرتب کر کے شائع کیا جائے۔" (ص : ۵، ۶) نہ معلوم اب یہ نوٹس بھی موجود و محفوظ ہیں یا نہیں ؟ اگر یہ حاصل ہو جائیں اور موجودہ حالت میں ہی شائع ہو جائیں، تب بھی امید ہے کہ یہ اصحابِ فکر و نظر کے لیے خضر طریق سے کم نہ ہوگا۔ اس کتاب پر مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کا

بیش قیمت اور مفصل مقدمہ ہے۔ مولانا سیوہارویؒ نے حضرت مولاناؒ کی شخصیت، ان کی فکر سلیم، اسلام اور امت مسلمہ کے لیے درد بیکراں اور مولانا کی فکر و نظر کی گہرائی اور اس کتاب کی اہمیت کا دل کھول کر اعتراف کیا ہے۔

یہ کتاب دس فصلوں پر مشتمل ہے۔ اس سے پہلے گیارہ صفحات پر نہایت ہی فاضلانہ تمہید ہے، جس میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ رب کائنات نے تمام حیوانات میں جماعتی اور اجتماعی اصول پر زندگی بسر کرنے کا جذبہ ودیعت فرمایا ہے، پھر انسان جو اشرف المخلوقات ہے وہ اس سے کیوں کر محروم رہ سکتا ہے؟ خدا کی ربوبیت کا تقاضہ صرف یہی نہیں کہ وہ ضروریاتِ زندگی کا سامان کرلے، بلکہ اس نے انسان کے لیے دستور العمل بھی دیا ہے، جس پر عمل کرنا ہر انسان کے لیے ضروری ہے۔

پھر اصل کتاب شروع ہوتی ہے، جس کا مقصد جماعتی نظام کی ضرورت کو بتلانا ہے، پھر مولاناؒ نے چار فصلوں میں انسان کی چار اہم حاجتوں: تحفظِ مال، تحفظِ نسلی، تحفظِ ناموس و عزت اور تحفظِ جان کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ بغیر اجتماعی نظام کے ان مقاصد کا صحیح طریقہ پر حاصل ہونا ممکن نہیں۔ پانچویں فصل میں واضح کیا گیا ہے کہ جماعتی نظام کے برقرار رکھنے کے لیے انسانی حکومت ضروری ہے، انسانی حکومت کی جو صورت مروّج ہے، وہ دو طرح کی ہے، ایک شخصی حکومت، دوسرے جمہوری حکومت، یہ بات کہ شخص واحد حکمراں ہو اور اس کی زبان قانون ہو اہل دانش نے کبھی اس کو پسند نہیں کیا، عام طور پر عقلاءِ دہر کا فیصلہ جمہوری حکومت کے حق میں ہے، لیکن یہ جمہوری نظام چند در چند مفاسد کا مجموعہ ہے۔ مولاناؒ نے اس موضوع پر بڑی حکیمانہ گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ جمہوری حکومت میں ایک بھی نمائندہ ایسا نہیں ہوتا جس پر تمام لوگ متفق ہوں، الیکشن کے ذریعہ منتخب ارکان جو قانون بناتے ہیں اگر حلقہ وار ووٹ کا شمار کیا جائے تو یہ اکثریتی فیصلہ نہیں ہوتا، بلکہ اقلیتی فیصلہ ہوتا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ملک کے شہریوں کے دل میں اس قانون کا احترام نہیں پیدا ہوتا۔

چھٹی فصل میں مولاناؒ نے ان اسباب و نتائج پر گفتگو کی ہے جو انسانی نظامِ حکومت کی ناکامی کا باعث ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اوّل تو ہر انسان سمجھتا ہے کہ جو قانون واضع کیا گیا ہے، اس کے وضع کرنے والے ہمارے ہی جیسے انسان ہیں اور بشری خواہشات اور عصبیتوں سے مبرا نہیں ہے، اس لیے وہ قابل اعتماد نہیں ہیں دوسرے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ انہوں نے قانون سازی میں اپنے مصالح اور مفادات کو ترجیح دے کر جانب داری سے کام نہیں لیا ہے، تب بھی یہ ضروری نہیں کہ وہ قانون عام انسانوں کے لیے بھی مفید اور نافع ہو، تیسرے اگر واضع قانون نیک نیت بھی ہو اور قانون

مفید بھی، جب بھی چوں کہ کوئی بھی قانون انسان کی مطلق آزادی کو محدود کرتی ہے، اس لیے اس کا ماننا گراں خاطر ہوگا اور قانون کے تئیں احترام اور جذبۂ وفاداری دل میں پیدا نہ ہوگا۔

اس کے بعد قانون سازی کے لوازم پر گفتگو کی گئی ہے کہ واضع قانون کو کن صفات اور صلاحیتوں کا حامل ہونا چاہیے، پھر بتایا گیا ہے کہ انسان کے اندر ان صفات کا جمع ہونا اور بہ درجہ کمال پایا جانا ممکن نہیں، چنانچہ ساتویں فصل میں یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ وضع قانون کے لیے جو صفات اور صلاحیتیں مطلوب ہیں، وہ کائنات کی خالق اور رب کے سوا کسی مخلوق میں نہیں پائی جاسکتیں، پھر اللہ تعالیٰ کی صفت علم، صفت، ربوبیت، سماعت، کلام، تدبیر و ارادہ، انعام و اکرام، تعزیر و تعذیب اور وحدتِ الٰہ پر نہایت ہی ایمان افروز گفتگو کی گئی ہے، آٹھویں فصل میں اختصارِ مسئلہ کے لیے ان ہی مضامین کا خلاصہ ذکر کیا گیا ہے۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ انسان اپنے نظامِ اجتماعی کے لیے ایک قانون کا محتاج ہے اور خدا کے سوا کوئی نہیں جو اس قانون کو وضع کر سکے، تو اب نویں فصل میں اس بابت گفتگو کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین کا علم کس طرح حاصل ہو سکتا ہے، پھر مولاناؒ نے بڑے حکیمانہ انداز میں یہ بات ثابت کی ہے کہ ہر انسان براہِ راست قوانین الٰہی سے واقف نہیں ہو سکتا اور حضراتِ انبیا جن کے ذریعہ اللہ کی شریعت اللہ کے بندوں تک پہنچتی ہے، ان کی خصوصیات و امتیازات کا تفصیلی ذکر ہے۔ اس تمہیدی باب کی دسویں اور آخری فصل پوری کتاب کا مقصد اور نتیجہ ہے، کہ انسانیت کی فلاح کا ذریعہ صرف حکومتِ الٰہی ہے اور اس کے بعد مولاناؒ نے اجتماعی نظامِ الٰہی کی خصوصیات ذکر فرمائی ہیں۔

یہ مختصر لیکن چشم کشا کتاب کیا ہے؟ ایک مشعلِ راہ جس میں امت کی صلاح و فلاح کا راستہ دیکھا جائے اور ان کی ذلت و رسوائی کا سبب دوپہر کی روشنی کی طرح متلاشیانِ حق کو نظر آجائے۔ اس کتاب کی سطر سطر مولاناؒ کے اخاذ ذہن، بلند حوصلہ دماغ، کتاب و سنت کی غواص فکر، دردمند تڑپتا ہوا اور بے چین دل کی شاہد عدل ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ گو ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں آپ دوسری مذہبی اکائیوں کے ساتھ شریک رہے، لیکن حکومت الٰہیہ اور خلافت علی منہاج النبوۃ کی قیام کا نصب العین کبھی آپ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوا، کوئی دن نہ جس نے جستجوئے منزل میں آپ کو بے چین نہ رکھا ہو اور کوئی شب نہ تھی جس نے اس فکر میں آپ کی کروٹوں کو بے سکون نہ کیا ہو۔

مولاناؒ کوئی ادیب اور شاعر نہیں تھے، زبان بھی سنت موسوی کی متبع تھی، یعنی کسی قدر لکنت کے ساتھ گفتگو کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود دو باتیں مولاناؒ کی تحریر کا امتیاز ہیں: ایک تو مضامین

میں آورد کے بجائے آمد کی کیفیت، خداداد مضامین جن سے مولانا کی زبردست قوتِ فکریہ کا اندازہ ہوتا ہے، دوسرے مشکل مضامین کو بھی عام فہم اور موثر تعبیر کے ساتھ پیش کرنا، جس میں قلم کی روشنائی سے زیادہ مولاناؒ کے خونِ جگر کی آمیزش اہل نظر کو صاف نظر آتی ہے۔ ایسے بہت سے اقتباسات ہیں جو نقل کیے جانے کے لائق ہیں، لیکن یہ طوالت کا باعث ہوں گے، مگر جی چاہتا ہے کہ مولاناؒ کے بیان و تعبیر کے اسلوب کی بابت ایک آدھ اقتباسات ضرور ہی آپ کی خدمت میں پیش کردوں:

"علم التشریحات کے جاننے والوں نے انسانوں کے جسم اور اس کے تمام اعضاء کو ہزاروں بار چیر پھاڑ کر دیکھا ہے اور سرجری کی بڑی بڑی کتابیں لکھ ڈالی ہیں، وہ ان کی لمبائی، چوڑائی، موٹائی، گہرائی سب کو بتائیں گے، اس میں جو مرض پیدا ہو گا وہ بھی بتائیں گے، اس کا علاج بھی کریں گے، مگر وہ اس امر کے بتانے سے عاجز ہیں کہ ایک انسان کی آواز دوسرے انسان کی آواز سے، مرد کی آواز عورت کی آواز سے پھر ہر مرد وبچے کی آواز دوسرے مرد وبچے کی آواز سے اور ہر عورت اور بچیوں کی آواز دوسری عورت اور بچیوں کی آواز سے کیوں مختلف ہے؟ کوئی ایک آواز دوسری آواز سے کبھی نہیں ملتی، اس چند کے اندر خالق نے اپنے ارادہ سے کیسی کیسی تدبیر کی ہے کہ اسی چند انچ کی نالیوں سے اربوں قسم کی آواز نکلتی ہے اور کوئی ایک دوسرے سے نہیں ملتی...... اگر نباتات کے پتوں اور پھولوں کو دیکھو تو تمہیں نظر آئے گا کہ ایک ہی پھول کے درخت کی ہر ایک پتی اور پھول میں مختلف رنگ اور نقش و نگار ہیں، جن کو دیکھ کر تمہاری آنکھوں کو ٹھنڈک اور لذت محسوس ہوتی ہے اور دل میں مسرور ہوتے ہو، مگر یہ تو سوچو کہ پودا ایک، زمین ایک، زمین کی کھاد اور آب و ہوا ایک، اس وحدت اور یکجہتی کے باوجود مختلف رنگ اور مختلف نقش و نگار کس طرح پیدا ہو گئے؟ مادیات جن سے پودوں کو غذا ملتی ہے اور جن سے وہ پرورش پاتے ہیں، ان میں نہ ارادہ ہے، نہ شعور ہے کہ کچھ بھی کر سکیں، چہ جائیکہ اس حسن و ترتیب و حسن صنعت کے ساتھ کسی کام کو انجام دے سکیں، پھر نیلے، پیلے، اودے، سرخ اور گلابی رنگ ایک خاص تناسب سے ہری ہری ڈالیوں کی پتیوں اور کلیوں میں کس طرح پیدا ہو گئے؟ ان سوالات کا جواب تم یا کوئی دوسرا دانش مند دے سکتا ہے؟ سوا اس کے کہ وہ یہ کہے کہ خالق کائنات کی قدرت کی یہ صناعی ہے، جس نے اپنے ارادہ اور حسن تدبیر سے پتیوں، پھولوں اور کلیوں میں یہ تمام گلکاریاں کی ہیں۔

☆☆☆

بانیٔ امارتِ شرعیہ کی شخصیت کے چند امتیازی پہلو

﴿بدر الحسن القاسمی، معتمد تعلیمات دار العلوم سبیل السلام﴾

اپنا "آشیانہ" پھونک کر زمانہ کو "روشنی" بخشنے والوں کی اگر کوئی مختصر سی فہرست بھی تیار کی جائے تو حضرت مولانا ابو المحاسن سجادؒ کا نام اس میں نمایاں اور سر فہرست ہوگا، اس لیے امارتِ شرعیہ کے آفس میں آویزاں تختی پہ یہ شعر۔

پھونک کر اپنے آشیانہ کو بخش دی روشنی زمانہ کو

مولانا سجادؒ کی ملی وسیاسی زندگی کی حسین تعبیر اور ان کی زندگی کا خلاصہ کہا جاسکتا ہے۔

جواں سال اور ہونہار فرزند دم توڑ رہا ہے، لیکن اللہ کی راہ میں نکلے ہوئے باپ کو اتنا موقع نہیں ہے کہ اس کی تیمارداری کر سکے۔ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت جب جان ومال، آل واولاد سب سے بڑھ جائے تو اسی طرح کے کرشموں کا ظہور ہوتا ہے۔

کاشت کی تھوڑی بہت زمین جس پر گذر بسر ہو رہا تھا، مال گزاری کے قانون کے تحت نیلام ہو جاتی ہے یا دوسرے لوگ اپنے نام پہ کرالیتے ہیں، لیکن اللہ کے اس بندے کو جب اس کی اطلاع ہوتی ہے تو اس سے اس طرح یکسو ہو جاتا ہے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اُسے ملت کے کاموں سے اتنی فرصت ہی کہاں کہ مال اور مال گزاری کے مسائل کی طرف توجہ کر سکے، اسے تو یہی خیال ہوتا ہے کہ پھانس تھی جو نکل گئی؛ چنانچہ کہا بھی یہی کہ: "اس طرف سے یکسوئی تو ہوئی، جانے دو، اس کا بھی تعلق لگا ہی رہتا ہے، وہ بھی ختم ہو جائے تو اللہ کے بندوں کی خدمت میں پوری یکسوی ہو جائے۔"

ایک نواب صاحب تنہائی میں آکر یہ درخواست کرتے ہیں کہ مجھے اس کا موقع دیجئے کہ میں

آپ کی خدمت کر کے سعادت حاصل کروں، تو زبان سے نکلتا ہے کہ :

"مجھ کو معاف رکھئے، اس سے ہمارے اور اللہ کے درمیان توکل کا جو رابطہ ہے اس میں خلل واقع ہو جائے گا۔" جس شخص کو اللہ نے ایمان ویقین کے ایسے بلند ترین مقام پہ فائز کیا ہو، اس کی زندگی کے کس پہلو پر روشنی ڈالی جائے اور کسے چھوڑا جائے ؟

اپنا آشیانہ پھونک کر زمانے کو روشنی بخشا، یہ تو زندگی کا ایک رُخ ہوا، مولانا سجادؒ کی زندگی تو اتنی جامع اور ہمہ جہت تھی کہ ہر طرف سے :

ع کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

مولانا محمد سجادؒ ایک نامور فقیہ اور بلند پایہ عالمِ دین، ایک روشن دماغ مفکر اور عظیم قائد، ایک صاحب دل دینی و سیاسی رہنما، ایک مخلص اور باغیرت وحمیت انسان تھے اور ان سب سے بڑھ کر ایک خاموش مگر طوفان بداماں رہبر، ایک بظاہر پرسکون مگر بساطِ سیاست پر انقلاب انگیز تبدیلیوں کا منصوبہ دماغ میں رکھنے والا مدبر، وضع قطع اور بول چال کے لحاظ سے مسکین صورت لیکن عمل کی دنیا میں ایک شعلۂ جوالہ بلکہ دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان۔

ایک ایسی شخصیت پہ قلم اٹھانے کے لیے میرے پاس اس وقت نہ ان کی تحریریں ہیں، نہ مسودات، نہ مضامین اور نہ مقالات، لے دے کر ان کے فتاویٰ کا مجموعہ اور "حیاتِ سجاد" کے نام سے ایک کتابچہ ہے، جس میں ان کے معاصرین و معتقدین نے ان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مولانا سجادؒ کی کوئی مفصل سوانح لکھی جائے، جس میں ان کے علمی مقام پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ان کے مشن اور پیغام کو اُجاگر کیا جائے۔

لائق شکر ہیں امیر شریعت سادس "حضرت مولانا نظام الدین صاحب اور اُن کے رفیق کار حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی"، جنہوں نے امارتِ شرعیہ کے کاموں میں نئی روح پھونکی ہے اور بہت سی بھولی بسری چیزوں کو زندگی بخشی ہے۔ یہ سیمنار بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

میری نظر میں حضرت مولانا محمد سجادؒ صاحب کی زندگی کے جو پہلو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے :

مولانا محمد سجادؒ کو اللہ نے غیر معمولی دل ودماغ کا حامل، علم وعمل کا پیکر، خلوص وللّٰہیت کا مجسمہ اور ایثار وقربانی کا مرقع بنایا تھا۔

۱۳۱۰ھ میں ان کی پیدائش ہوئی اور ۱۳۵۹ھ میں وصال ہوا۔ اس مختصر سی زندگی میں انہوں

نے مختلف علوم وفنون کی تعلیم وتدریس کا کام بھی کیا، فتوے بھی لکھے، ملکی اور ملی سیاست میں اس حد تک دخیل ہوئے کہ الگ پارٹی بنا کر بہار میں اس کی حکومت بھی قائم کرائی، جمعیۃ علماء اور انجمن علماءِ بہار قائم کی، "امارتِ شرعیہ" جیسا منفرد ادارہ قائم کیا اور افتاء وقضاء کا بے مثال نظام قائم کیا۔

مولانا سجادؒ صاحب کی عام شہرت تو ایک معقولی اور منطق وفلسفہ میں مہارت رکھنے والے عالم کی تھی، لیکن قرآن، حدیث اور فقہ میں ان کو اللہ نے کیسی بصیرت عطا فرمائی تھی، اس کی کچھ جھلکیاں ان کے لکھے ہوئے فتاویٰ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

ان کے شاگردِ رشید مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کا بیان ہے کہ زرعی بل کے موقع پر جب اسمبلی میں یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا کہ اوقاف پر شرعی زرعی ٹیکس عائد نہیں کیا جاسکتا تو میں نے پوچھا کہ اس کا مأخذ قرآن میں کیا ہے؟ تو فرمایا اس کا مأخذ قرآنی آیت: فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَا اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِیْنَ یُبَدِّلُوْنَهٗ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝ ہے کیوں کہ کسی طرح کی تبدیلی جب وصیت میں جائز نہیں ہے جو مرض الموت میں کی جائے یا کی جاتی ہے تو وقف میں بدرجہ اولیٰ جائز نہیں ہوگی، جو صحت اور طمانیت کی حالت میں خدا کی راہ میں وقف کرتا ہے۔ اسی بنیاد پر "شرط الواقف کنص الشارع" کا فقہی ضابطہ بنایا گیا ہے۔ (حیاتِ سجاد ص: ۳۳)

یہود ونصاریٰ اور مشرکین کے درمیان مزاجی فرق پر ان کا استدلال کہ قبولِ حق کی استعداد ہی نصاریٰ اور یہود میں نہیں ہوتی، چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ:

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ط

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایک کو مغضوب اور دوسرے کو ضالین میں شمار کر کے ان کے طریقوں سے علاحدگی کی مستقل تلقین کی ہے، اس کے برخلاف مشرکین کے بارے میں آیا ہے کہ: وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَیُدْهِنُوْنَ ۝ ط ان کی غیر معمولی قرآنی بصیرت اور دقیقہ اسی کی دلیل ہے۔

قرآنی اسلوب سے مناسبت اور بلاغتِ قرآن کی معرفت کی یہ مثال بھی مولاناؒ کے گہرے علم اور بلند پایہ ادبی ذوق کو بتلاتا ہے کہ قرآنی آیت: فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝ کے بارے میں جب انہوں نے علامہ زمخشریؒ کا بیان کردہ یہ نکتہ سنا کہ ایک شخص نے غلطی سے عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ کی جگہ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ پڑھ دیا تو ایک بدو (دیہاتی) سن کر چیخنے لگا کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہوسکتا۔

علامہ زمخشریؒ نے اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ زلت اور لغزش کے بعد اربابِ دانش رحم و

مغفرت کا ذکر نہیں کرتے، ورنہ لوگ اور بھی گناہوں پر جری ہو جائیں گے۔

مولانا محمد سجاد صاحبؒ نے زمخشری جیسے امام بلاغت کی اس توجیہ کو سن کر فرمایا کہ: وجہ بدو (دیہاتی) کے انکار و تعجب کی یہ نہیں ہے بلکہ فَاعْلَمُوْا کی تنبیہ کا بلیغ تیور ہے، جو اس جگہ رحم و مغفرت کے منافی ہے۔ اس سے مولاناؒ کے ذوقِ بلاغت اور قرآنی اسلوب سے مناسبت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مولانا سجادؒ کا علمی تبحر کس درجہ کا تھا، اس کا اندازہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے: ''ہماری جماعت میں مشہور ہے کہ زبردست دلائل کے ساتھ کسی بات کو مدلل کر کے بیان کرنا حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا خاص حصہ ہے اور یوں بھی مفتی صاحب کو فقہ اسلامی میں بڑا کمال حاصل ہے، لیکن جماعت کے ذمہ دار ارکان اور میں نے بارہا یہ منظر دیکھا کہ جب کسی مسئلہ پر حضرت مولانا سجاد صاحبؒ دلائل و براہین فقہی کے ساتھ بحث فرماتے تو حضرت مفتی صاحب بھی بے حد متاثر ہوتے اور ان کے علمی تبحر کا اعتراف کرتے ہوئے بے ساختہ ان کی زبان سے کلماتِ تحسین نکل جاتے۔ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ: ''مولانا سجادؒ'' فقیہ النفس'' عالم ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے مسائل کی روح سمجھنے کا ان کو فطری ملکہ عطا فرمایا ہے۔''

حضرت مولانا سید محمد انور شاہؒ صاحب نور اللہ مرقدہ جو اس زمانہ میں علم حدیث کے مجدد گذرے ہیں، کا یہ فرمانا میرے نزدیک مولانا سجاد صاحبؒ کے تبحر علمی کے لیے ایک بہترین ''سند'' ہے۔ بعینہ یہی بات میں نے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحبؒ کی زبان سے بھی سنی ہے۔ (حیاتِ سجاد ص: ۷۰) علامہ سید سلیمان ندویؒ مولانا کے علم و فضل کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''فلسفہ تاریخ کے ماہر کہتے ہیں کہ علم اور عمل کم یکجا ہوتے ہیں، لیکن ان کمیاب مثالوں میں مولانا سجادؒ کی ذات بھی تھی۔ وہ اپنے وقت کے بڑے مشاق مدرس اور حاضر العلم تھے، خصوصیت کے ساتھ معقولات اور فقہ پر ان کی نظر بہت وسیع تھی، جزئیاتِ فقہ اور خاص کر اس کا وہ حصہ جو معاملات سے متعلق ہے، نظر میں تھی، امارتِ شرعیہ کے تعلق سے اقتصادی و مالی و سیاسی مسائل پر ان کو عبور کامل تھا، زکوٰۃ و خراج، قضاء و امامت اور ولایت کے مسائل کی پوری تحقیق فرمائی تھی، ہر چند کہ سالہا سال سے درس و تدریس و مطالعہ کا اتفاق نہیں ہوا تھا، مگر جب گفتگو کی گئی، ان کا علم تازہ نظر آیا، ان کا علم کتابی نہ تھا، بلکہ آفاقی تھا۔'' (حیاتِ سجاد ص: ۵۷-۵۸)

مولانا سجادؒ کے ساتھ جن لوگوں کو رہنے اور ان سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا ہے، ان سبھوں کی شہادت یہ ہے کہ ان کے وسعتِ مطالعہ کا یہ حال تھا کہ عام سیاسی و اجتماعی مسائل کے بارے

میں شرعی دلائل اور فقہی نظائر تلاش کرنے میں ان کو کسی تأمل کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی، زندگی کے عام معاملات میں بھی ان کی نظر سیدھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہؓ کے تعامل کی طرف جاتی تھی؛ چنانچہ اکثریت کی رائے پہ فیصلہ کے بارے میں کسی نے دریافت کیا تو انہوں نے فوراً اس کمیٹی کا ذکر جو حضرت عمرؓ نے اپنے بعد خلیفہ کے انتخاب کے لیے بنائی تھی اور ان کو ہدایت کی تھی کہ اگر رائیں برابر آئیں تو اس گروپ کی رائے پر عمل کیا جائے جس طرف حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ ہوں۔

علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کا کسی عالم کے بارے میں "فقیہ النفس" کہنا کیا مفہوم رکھتا ہے؟ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ساری زندگی میں یہ لقب چند ہی افراد کے لیے استعمال کیا ہے اور متاخرین فقہائے امت میں سے بھی چند ہی پاک نفوس ایسے ہیں جو علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے معیار کے مطابق "فقیہ النفس" کہلانے کے مستحق ہیں۔

علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ نے یہ لقب ایک تو علامہ کاسائیؒ کے لیے استعمال کیا ہے جنہوں نے "بدائع الصنائع" جیسی فقہی انسائیکلو پیڈیا چھوڑی ہے، جو فقہِ حنفی کی کتب مراجع میں ایک منفرد اور امتیازی مقام کی حامل ہے۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ جن کی "ردّ المحتار" تمام اربابِ افتاء کا مرجع ہے، وہ بھی اپنی غیر معمولی فقہی جامعیت اور بصیرت کے باوجود علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے یہاں فقیہ النفس کہلانے کے مستحق نہ ہو سکے اور شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ علامہ شامیؒ کے مقابلے میں زیادہ فقیہ النفس کہلانے کے مستحق ہیں۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت مولانا محمد سجادؒ کا حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی نظروں میں کیا مقام تھا کہ انہوں نے ان کے بارے میں بار بار یہ فرمایا کہ مولانا سجاد "فقیہ النفس" ہیں۔

دراصل فقیہ النفس کہلانے کا مستحق وہی شخص ہو سکتا ہے فقہ جس کا ملکۂ ثانیہ بن گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کو فقہی معلومات بے پناہ ہوں، کتابوں کی کتابیں ازبر ہوں، لیکن خود اس کا مزاج فقہی نہ بن سکا ہو اور فقہ اس کے رگ و ریشہ میں اس طرح سرایت نہ کی ہو کہ ہر نئے مسئلہ پر اس کی فقہی بصیرت اسے صحیح شرعی حکم تک رہنمائی کرے۔

میری نظر میں علامہ کشمیریؒ کے اس ایک جملہ کے بعد حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجادؒ صاحبؒ کی علمی عظمت، فقہی بصیرت اور مجتہدانہ ذوق نظر کے لیے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

"حقیقت یہ ہے کہ فقہی مسائل میں جن باریک پہلوؤں تک مولانا محمد سجادؒ کی نظر جاتی ہے، وہ ہر عالم دین کے بس کا کام نہیں ہے۔"

افسوس ہے کہ مولانا محمد سجادؒ صاحب نے اپنی کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں چھوڑی اور ان کی زندگی کے ملکی حالات، مسلمانوں کی سیاسی زبوں حالی اور مولاناؒ کی مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں فکر مندی نے انہیں اس قابل بھی کہاں چھوڑا تھا، کہ وہ جنھوں نے ایک ماہر مدرس ہونے کے باوجود تدریس کے مشغلہ کو ترک کیا تھا، وہ تصنیف و تالیف کے لیے یکسو ہوتے؛ تاہم ان کے قلم اور ان کی زبان سے نکلے ہوئے مختلف شذرات کو اگر اکٹھا کیا جائے اور ان کے فتاویٰ کا مجموعہ بھی سامنے رکھا جائے، ان کی مختلف تقریروں اور مضامین پر نظر ڈال کر ان سبھوں کو ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کی جائے تو بہت سے ایسے علمی نکات سامنے آتے ہیں جو نہ صرف اجتماعی و سیاسی مسائل کے حل میں مدد و معاون ہو سکتے ہیں بلکہ خود علماءِ دین اور اربابِ شرع متین کے لیے بھی خاص بصیرت افروز اور نظر کشا بھی ہو سکتے ہیں۔

قرآن سے شغف اور فہمِ قرآن کے امتیازی ذوق کا اندازہ مولانا عبد الصمد رحمانیؒ کے حوالہ سے نقل کردہ اقتباس سے ہوا ہوگا، احادیث کے بارے میں بھی مولانا کا نقطۂ نظر سن لیجیے۔

مولانا عبد الصمد رحمانیؒ جو خود مولاناؒ کے بلند پایہ شاگرد اور علماء کی صف میں امتیازی مقام رکھنے والے صاحب تصانیف عالم اور فقیہ گذرے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

"احادیث کے متعلق مولانا کا نقطۂ نظر بہت بلند پایہ کا تھا۔ مولاناؒ فرماتے تھے کہ ہر حدیث کسی نہ کسی آیت کی تفسیر ہے، نیز یہ کہ ہر حدیث مشکوٰۃِ نبوت کی ہی تنویر کی روشنی میں جو بمَا اَرَاكَ اللّٰهُ کے ماتحت آپ کو حاصل تھی، اس امر پر زبردست دلیل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تشریح و تبیین آیاتِ قرآنی کی فرمائی ہے، سب کے لیے آپ نے قرآن کے الفاظ میں اشارات پائے ہیں، جس طرح مجتہدین آیاتِ منصوصہ میں مدارِ حکم کے اشارات پاتے ہیں، پھر اس پر قیاس کی بنیاد رکھتے ہیں اور فروعی احکام کا استخراج کرتے ہیں؛ اس لیے مولاناؒ کی رائے تھی کہ ہر حدیث کا تعلق قرآن سے بتانا چاہیے۔ (حیات سجاد ص: ۳۵)

مولانا اصغر حسین صاحبؒ جو مولانا کے نیاز مند شاگرد ہوتے ہیں، شاگرد ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی طالب علمی اور تدریسی زمانہ کے شاہد بھی ہیں، ان کا بیان ہے کہ:

"حضرت استاذِ محترم مفکر اعظمؒ مذہب و عمل میں حنفی تھے، لیکن تنگ نظروں کی طرح اہل سنت کے دوسرے فرقوں سے جنگ آزما نہ تھے، بلکہ فرماتے تھے کہ نماز کی مختلف

صورتیں جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں، ایک مرتبہ بھی سب پر عمل کر لینا چاہیے، تاکہ سنت کی برکات سے محرومی نہ رہ جائے۔" (حیاتِ سجاد: ۷۰)

یہ ٹھیک وہی نقطۂ نظر ہے جس کے نہ صرف حامل بلکہ اس کے مطابق عامل بھی طبقہ علماء کے سر خیل شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ تھے، جس کا ذکر ان کے باکمال شاگردوں نے مختلف عنوان سے کیا ہے۔

مولانا اصغر حسین صاحبؒ کا تبصرہ یہ ہے کہ مولانا محمد سجاد صاحبؒ کے اس نقطۂ نظر سے ظاہر ہے کہ مولاناؒ کے نزدیک احادیث مختلفہ میں اختلاف نسخ کا نہ تھا بلکہ اختلاف اباحت یا رخصت و عزیمت کا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس تحقیقی مسلک کے مطابق بہتیرے مذہبی اختلافات کا قلع قمع ہو جاتا ہے؛ مگر مسلمانوں کی بدنصیبی ہے کہ فروعات و اجتہادیات مسائل کو معرکۃ الآرا بنا کر لَا تَنَازَعُوْا کی نہی صریح اور اسی شغل میں رہ کر وَ اَعِدُّوْا کے امر ناطق کو چھوڑ بیٹھے، جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا نقشہ سامنے ہے۔

جہاں تک فقہی مسائل میں درک و بصیرت کی بات ہے تو پہلے ہی گذر چکا ہے کہ وہ اس علم میں امامت کا درجہ رکھتے تھے اور علامہ انور شاہؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی نظروں میں وہ "فقیہ النفس" کہلانے کے مستحق تھے۔

ان کے تلمیذ رشید مولانا عبدالصمد رحمانیؒ فقہ میں انکے درجہ و مقام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مولانا جس طرح اختلاف احادیث کے باب میں جمع اور تطبیق سے کام لیتے تھے اور اختلافِ احوال اور مقتضائے ماحول پر اس کو محمول فرماتے تھے یا اختلافِ مدارج یعنی اباحت، رخصت، عزیمت کو سبب قرار دیتے تھے، اسی طرح فقہاء کے مختلف اقوال میں جمع و تطبیق سے کام لیتے تھے اور امام صاحبؒ اور صاحبینؒ کے اختلاف نیز دوسرے ائمہ امام شافعیؒ وغیرہم کے اختلاف کو خصوصاً معاملات میں مقتضائے ماحول اور اسی طرح کے دوسرے اسباب پر محمول فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ مختلف جہات کی بناء پر جو مختلف احکام ہیں، ان میں واقعہ کے اعتبار سے دراصل کوئی اختلاف ہی نہیں ہے۔"

"اسی نظریہ کے مطابق مولاناؒ یہ ہدایت فرماتے تھے کہ مفتی کو امام غزالیؒ کی کتاب کے باب استصلاح کو ضرور مطالعہ کرنا چاہیے، تاکہ حوادثِ آئندہ و جاریہ کے متعلق وہ بصیرت کے ساتھ فتویٰ دے سکے۔"

"چنانچہ مولانا ان مسائل میں جو ارتقائی اسباب کی بنا پر آئے دن نئی نئی میں

صورتوں رونما ہوا کرتے ہیں، بلا تکلف صائب رائے دیتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کو پہلے سے ہی سوچ بیٹھے ہیں اور اس کے شواہد و نظائر پر غور و فکر کے تمام مراحل کو طے فرما چکے ہیں۔" (حیاتِ سجاد: ۳٦)

مولانا سجاد صاحبؒ کی علمی و فقہی بصیرت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ جوش و خروش کے ماحول اور سر تاپا جذباتیت اور نعرہ بازی کی فضا میں بھی کسی مسئلہ کا شرعی پہلو کبھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا تھا۔

مولانا منظور نعمانی صاحبؒ کا بیان ہے کہ:

"لکھنؤ میں مدحِ صحابہؓ ایجی ٹیشن جاری ہے، مولانا حسین احمد مدنیؒ کی قیادت میں اجتماعی سیول نافرمانی ہو رہی ہے، ٹیلے کی مسجد میں جنگ کا محاذ قائم ہے، جب گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو پردہ نشیں عورتوں کے مجمع میں سے ایک خط آیا، اس میں ایک عورت نے اپنی دینی ولولہ کا اظہار کیا تھا اور یہ لکھا تھا کہ ایجی ٹیشن کا موقع ہم عورتوں کو بھی دیا جائے، اس خط میں صحابیاتؓ کے غزوات میں شرکت کا حوالہ بھی دیا گیا تھا۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے فرمایا کہ لاؤڈ اسپیکر سے تم اس خط کا جواب میری طرف سے دیدو کہ ابھی تو ہم لوگ باقی ہیں، جب تک ہم میں سے کوئی ایک بھی موجود ہے یہ گوارا نہیں ہو سکتا کہ آپ اس راہ میں تکلیف اٹھائیں۔ مولانا محمد سجادؒ نے نعمان صاحبؒ کو آواز دے کر فرمایا کہ: مستورات کو یہ بھی سمجھا دینا کہ حرب سلمی (آئین جنگ یا سیول نافرمانی) اور تلوار کی جنگ کے احکام شریعت میں جداگانہ ہیں، تلوار کی لڑائی میں تو خاص حالات میں عورت کے لیے بھی شرکت کا موقع ہو جاتا ہے، مگر آئینی جنگ جس میں اپنے آپ کو گرفتار ہی کرا لیا جائے، اس میں شرکت کا عورتوں کے لیے کوئی موقع نہیں ہوتا، بلکہ شرعاً ان کے لیے ناجائز ہے کہ وہ اپنے کو غیر آدمیوں کے ہاتھوں گرفتار کرا کے قید میں جائیں؛ لہٰذا ان بہنوں کا جذبہ تو قابل قدر ہے، لیکن سیول نافرمانی میں عمل شرکت کے خیال کو وہ قطعی طور پر دل سے نکال دیں، ان کے حق میں وہ معصیت اور خدا کی نافرمانی کا باعث ہے۔"

نعمانی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہی وہ خصوصیات تھیں جنھوں نے مجھے ان کا فریفتہ کر دیا تھا۔ واللہ العظیم اگر میرے بس میں ہوتا تو میں سیاسی کام کرنے والے کم از کم نوجوان علماء کے لیے تو فرض قرار دیتا کہ وہ کچھ حضرات کی زیرِ نگرانی ٹریننگ حاصل کریں۔ (حیاتِ سجاد ص: ۱۳۵)

ان کے کمالِ علمی کا یہ پہلو بھی قابلِ ذکر ہے کہ ہر پیش آنے والے واقعہ کے بارے میں فوراً ان کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی طرف جاتا اور اس کی کوئی نہ کوئی نظیر ان کو بغیر کسی تکلف اور تاخیر کے مل جاتی۔

۱۹۳۴ھ میں بہار کی سرزمین پر یہ وہ قیامت خیز زلزلہ آیا جس میں چند لمحوں کے اندر اندر لاکھوں انسان موت کے آغوش میں پہنچ گئے، کہیں کنویں خشک ہو گئے، کہیں نہروں اور دریاؤں کا بہاؤ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو گیا، مکانوں اور انسانی ٹھکانوں پہ کیا کچھ گزر گئی، کتنے شہر ویران ہو گئے، کتنی آبادیاں زیر زمین دفن ہو گئیں، اس کا صحیح علم اللہ ہی کو ہے۔ مولانا سجادؒ رمضان المبارک کے آخری ایام میں دیہات کا دورہ کر کے بتیا تشریف لا رہے تھے، ٹرین جیسے ہی بتیا اسٹیشن پر پہنچی کہ دفعتاً زلزلہ شروع ہو گیا، مسافرین اور پلیٹ فارم پہ موجود لوگ پریشانی اور بدحواسی کے عالم میں شور وغوغا کرنے اور بھاگنے لگے، لیکن مولاناؒ مرحوم اپنی عصا کو پلیٹ فارم پر ٹیک کر نہایت استقامت کے ساتھ کھڑے ہو کر اللہ اللہ کہنے لگے اور حاضرین کو بھی تلقین کی، چنانچہ مسلم اور غیر مسلم بھی اللہ اللہ بآواز بلند کہنے لگے، اس کے بعد سکون ہوا۔

مولاناؒ نے فرمایا کہ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں ایک دفعہ زلزلہ آیا تھا، انہوں نے اسی طرح اپنا عصائے مبارک کو زمین پر دبایا، خدا نے رحم کیا، میں بھی ان کے غلاموں میں سے ہوں، اس لیے میں نے اس سنت پر عمل کیا۔ (حیاتِ سجاد ص: ۱۷۱)

مولانا محمد سجادؒ کی خدمات کا شاہکار "نظام امارتِ شرعیہ" کا قیام ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہار کی "مردم خیز لیکن مردم خور" زمین پہ کامیابی کے ساتھ اس نظام کو قائم کر لینا مولانا مرحوم کی کرامت ہی کہا جا سکتا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ جو خود بھی بہار نے کی سرزمین ہی سے تعلق رکھتے ہیں، انہوں بجا طور پر لکھا ہے کہ:

"بہار میں امارتِ شرعیہ کا قیام ان کی سب سے بڑی کرامت ہے، زمین شور میں سنبل پیدا کرنا اور بنجر علاقہ میں لہلہاتی کھیتی کھڑی کر لینا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔"

اس لیے اہل بہار کہہ سکتے ہیں:

اگا ہے سبزۂ خط رخ پہ اس کانِ ملاحت کے زمین شور سنبل بر نیارد کون کہتا ہے؟

جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مولانا سجادؒ کو اللہ تعالیٰ نے سیاسی مسائل میں جو بصیرت عطا کی تھی اور خاص طور پر اسلامی سیاسی اصولوں کو سمجھنے اور برتنے میں جو "امامت" کا مقام عطا فرمایا تھا، افسوس ہے کہ ان کے معاصرین اس کا برملا اعتراف کرنے کے باوجود اس شخص کے کرب والم کا صحیح اندازہ نہ کر سکے اور امت اس امام اعظمؒ کے افکار کو تحریک کی شکل نہ دے سکی، ورنہ برصغیر کے

مسلمانوں کا وہ حشر نہ ہوتا جو آج دیکھنے میں آرہا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا ہی کا بیان ہے کہ :

ان کی تواضع میں بلندی، ان کی سادگی میں بناؤ اور خاموش میں گویائی تھی، وہ اکیلے تھے، لیکن لشکر تھے، پیادہ تھے، لیکن برق رفتار تھے، وہ قال نہ تھے سراپا حال تھے، کہتے کم، کرتے زیادہ تھے، ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے "راہ اور منزل" کے فرق کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ (حیاتِ سجاد ص : ۵۳)

جمعیۃ علماء کے اجلاس مراد آباد منعقدہ ۱۹۴۳ھ کے خطبہ صدارت پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں :

"میں خوش ہوں کہ (میری غیر حاضری کی بدولت) ایک خاموش ہستی بولی اور ایک بے زبان نے زبان کے جوہر دکھائے اور ایک ہمہ تن سوز و گداز نے کاغذ کے صفحوں پر اپنے دل کے ٹکڑے بکھیرے۔" (حیاتِ سجاد ص : ۶۰)

اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ فرماتے ہیں کہ :

حضرت مولانا سجادؒ کو جس طرح علومِ نقلی و عقلی میں کمال حاصل تھا اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ سیاسی و اجتماعی مسائل میں بھی ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔

مراد آباد میں جب جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا اور مولاناؒ نے بحیثیت صدر خطبہ صدارت سنایا تو زمیندار، انقلاب، اور دوسرے اسلامی اخبارات نے خطبہ صدارت پر ریویو کرتے ہوئے لکھا کہ مولانا سجادؒ کی صورت اور گفتگو سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ایسا شخص بھی اسلامی سیاسیات بلکہ سیاسیاتِ حاضرہ کا اس قدر مبصر اور عمیق النظر ہو سکتا ہے اور واقعہ بھی یہ خطبہ صدارت سیاسیاتِ اسلامی کی بہترین انسائیکلو پیڈیا ہے۔ (حیاتِ سجاد ص : ۷۷)

مولانا سجادؒ نے گائے کی قربانی کے سلسلہ میں اپنے ایک فتویٰ کی تائید میں حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات کی یہ عبارت نقل کی ہے، جس میں اسلام اور مسلمانوں کی بے نوائی کا نقشہ ان الفظوں میں کھینچا گیا ہے :

"غربت اسلام نزدیک بیک قرن بر نہج قرار یافتہ است کہ اہل کفر بمجرد اجراءِ احکامِ کفر بر بلادِ اسلامیہ راضی نمی شوند می خواہند کہ احکام اسلامیہ بالکلیہ زائل گردد و اثرے از مسلمانان و مسلمانی پیدا نہ شود۔" (حیاتِ سجاد : ۷۴)

تقریباً ایک صدی سے اسلام کی غربت اور بے نوائی کا یہ حال ہو گیا ہے کہ کفار اسلامی ملکوں میں بھی محض احکام کفر کے جاری ہونے پہ مطمئن اور قانع نہیں ہیں، بلکہ وہ اس بات کے بھی خواہاں ہیں کہ اسلامی احکام مکمل طور پر مٹ جائیں اور مسلمان اور مسلمانی کا کہیں نام و نشان باقی نہ رہ جائے۔

مجدد صاحب کے زمانے میں تو مغلوں کی حکومت تھی، اس وقت جب یہ حال تھا تو انگریزوں کے تسلط پہ ایک صدی گزر جانے کے بعد اسلام اور اور مسلمانوں کو بر صغیر میں کس طرح کے خطرات کا سامنا تھا، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

انگریزوں کے اقتدار کو ختم کرنے کے لیے آزادی کی جدوجہد جب زوروں پر آئی تو ہندو اور مسلمان دونوں ہی متحد ہو کر میدان میں آگئے۔ ہندو لیڈروں کے ذہن میں شروع سے یہ حقیقت واضح تھی کہ انگریزوں کے جانے کے بعد اقتدار ملک کی اکثریت کے ہاتھوں میں ہوگا، لیکن آزادی کی تحریک مسلمانوں کے اشتراک کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔

لیکن مسلمان زعماء و قائدین میں سے کم ہی ایسے تھے جن کے ذہن میں انگریزوں کے بعد کے ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کا کوئی واضح خاکہ ہو یا مستقبل میں مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت کے لیے کوئی ٹھوس حکمت عملی انہوں نے اختیار کی ہو۔

مولانا محمد سجادؒ کے ذہن میں نہ صرف مستقبل کا واضح تصور تھا، بلکہ امکانی حد تک آنے والے خطرات کو ٹالنے کے لیے مکمل منصوبہ بھی تھا۔ اس سلسلہ میں بلاشبہ ان کو علماء کا سر خیل اور اسلامی سیاسیات کا مفکر اعظم کہنا چاہیے۔

سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

> "حضرت مولانا سجاد مرحوم کا خیال تھا کہ جب تک ہندوستان میں نیشنل گورنمنٹ قائم ہو، اس وقت مسلمانوں کا اندرونی نظام اور ان کی شرعی تنظیم مکمل ہو جائے، تا کہ نیشنل گورنمنٹ کے زمانہ میں مسلمانوں کی معاشرت، ان کا کلچر، ان کی تہذیب، ان کے اوقاف، ان کے نکاح و طلاق وغیرہ، ان کی زکوٰۃ، ان کا عشر، یہ تمام باتیں ایک شرعی امیر کے ماتحت ہوں اور اس شرعی تنظیم کو آئندہ ہندوستان کی دستورِ اساس میں مسلمانوں کے ایک حق کی حیثیت سے تسلیم کرا لیا جائے، تا کہ مسلمانوں کے اندرونی اور اصلاحی معاملات حکومت کی مداخلت سے محفوظ ہو جائیں۔" (حیاتِ سجاد: ۹۷)

پورے ہندوستان کے لیے امیر شریعت کے انتخاب کے بارے میں مولاناؒ کی جدوجہد اور ان کی بے چینی اس لیے تھی، تا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل محفوظ ہو سکے۔ اپنے اس نقطۂ نظر

کی اہمیت پہ مولانا ابوالکلام آزادؒ ہی نہیں، خود حضرت محمود حسن دیوبندیؒ کو بھی انہوں نے مطمئن کر لیا تھا، لیکن دوسرے علماء کی طرف سے لیت ولعل کا انداز دیکھ کر مولانا سجادؒ نے ۱۹۱۷ء میں "انجمن علماءِ بہار" قائم کی اور ۱۹۲۱ء میں "امارتِ شرعیہ بہار واڑیسہ" کی داغ بیل ڈالی؛ جس کی اہمیت و افادیت کا آج سبھی اعتراف کرتے ہیں اور یہ تمنا کرتے ہیں کہ کاش پورے ملک میں یہ نظام قائم ہو جاتا۔ (دینی جدوجہد کا روشن باب ص ۱۳۰ بحوالہ حیاتِ سجاد ص: ۱۰۸)

مولانا احمد سعید دہلویؒ کا یہ بیان حقیقت کا آئینہ دار اور حسرت والم کا مرقع ہے کہ:

"اگر علماء میں مداہنت اور منافست نہ ہوتی اور صوفیاء میں اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ ہونے کا شوق نہ ہوتا تو آج تمام ہندوستان ایک شرعی امیر کے تحت زندگی بسر کر رہا ہوتا اور اسلام کی حقیقی برکات سے متمتع ہوتا اور ان کی روح حکومت کی غلامی سے آزاد ہوتی، اگرچہ جسم غلامی ہی میں مقید ہوتا۔"

ایک اور عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ:

"ان کا نقطۂ نظر بہت صاف اور روشن تھا، ان میں کوئی بناوٹ نہ تھی، وہ تصنع سے بالکل بری تھے، وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی بغیر امیر کے غیر شرعی زندگی سمجھتے تھے، کسی اسلامی ملک پر کفار کے تسلط کو وہ انتہائی تشویش کی نظر سے دیکھتے تھے اور اس غیر شرعی زندگی پر قرآن وحدیث سے استدلال کرتے تھے اور بعض دفعہ اس زندگی کی خرابیاں ذکر کرتے کرتے رونے لگتے تھے اور اس قدر روتے تھے کہ ان کی ہچکی بندھ جاتی تھی اور فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے دن جو سوال ہم لوگوں سے ہوگا اس کا جواب سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم خدا کے سامنے کس طرح عہدہ برآ ہونگے، ان کا خیال یہ تھا کہ کفر کے اس بے پناہ غلبہ اور اثرات کو جس قدر کم کیا جا سکے کرنا چاہیے، اس راستے میں جس قدر قربانیاں پیش کرنے کی ضرورت ہے، اس سے دریغ نہ کیا جائے۔

موجودہ مسلم دنیا کا سب سے نازک ترین اور پیچیدہ مسئلہ اور مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی آزمائش اور سب سے بڑا فتنہ سیاست ہی کا مسئلہ ہے جو مختلف اسلامی تحریکوں اور دینی جماعتوں کے درمیان افراط و تفریط کا شکار ہے اور جس کی صحیح اور شرعی اصول کے مطابق وضاحت اور حدبندی نہ ہونے کی وجہ سے ہر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے مسلم نوجوانوں کی بہترین صلاحیتیں باہم آویزشوں، مسلح آپسی تصادم اور قائم حکومتوں اور برسراقتدار حکمرانوں سے نبرد آزمائی کی نذر ہو جاتی ہیں۔

مصر سے لے کر الجزائر تک کی خونچکاں داستاں آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں، لیکن صحیح

شرعی قیادت کے فقدان کی وجہ سے یہ داستاں اور طول ہی پکڑتی جا رہی ہے اور مخالف اسلام طاقتیں مسلمانوں کی جذباتیت اور زود حسی کا اندازہ کر کے نئے نئے عنوانات سے ان کو برانگیختہ رکھنے کے لیے سو طرح سے جتن کرتی ہیں اور مسلمان اپنی سادہ لوحی سے اندرونی اور بیرونی سازشوں کا مسلسل شکار ہوتے جا رہے ہیں۔

افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ پچاس سالوں سے یہ جھوٹ مسلسل بولا جا رہا ہے کہ علمائے دین کے ذہن میں اسلام کا ناقص تصور ہے، مکمل تصور تو فلاں اور فلاں قائدین تحریک کے ذہن کی پیداوار ہے؛ حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ فکر و نظر کی تمام تر بے اعتدالیاں اسی لیے سامنے آئیں کہ خود بعض قائدین تحریک کا ذہن شرعی اصولوں کی پابندی کے بجائے موجودہ زمانہ کے انقلابی نعروں اور سوشلزم، کمیونزم جیسی انسانی مفسدانہ تحریکوں کے نہج پہ چلنے لگا اور شعوری یا غیر شعوری طور پر مسلمانوں کی مشکلات و مصائب میں مزید اضافہ کا باعث بن گیا۔

جہاں تک برصغیر کی تاریخ میں علمائے دین کی بصیرت اور سیاسی مسائل سے نہ صرف آشنائی بلکہ ان میں قائدانہ رول کی بات ہے، تو جس شخص کی نظر بھی شاہ ولی اللہؒ کی کتاب "ازالۃ الخفا" اور حجۃ اللہ البالغۃ"، مولانا اسماعیل شہیدؒ کی کتاب "منصب امامت"، مولانا انصاریؒ کی کتاب "انواع الدول"، مولانا حامد الانصاریؒ کی کتاب "اسلامی نظامِ حکومت"، مولانا اسحاق سندیلویؒ کی مرتب کردہ "اسلام کا سیاسی نظام" اور مولانا سجادؒ کی کتاب "حکومتِ الٰہیہ" پر ہوگی اور جو بھی سید احمد شہیدؒ کی تحریک اور مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی "ریشمی رومال تحریک اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی سیاسی جدو جہد سے واقف ہوگا، اس کے لیے یہ اندازہ یقیناً مشکل نہیں ہوگا کہ موجودہ زمانہ کے قائدین تحریک نے اساس تو انہیں افکار کو بنایا جو اس صدی کے شروع میں "حزب اللہ" اور "حکومتِ الٰہیہ" وغیرہ کے عنوان سے مولانا آزادؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور مولانا سجادؒ وغیرہ نے پیش کیے تھے، البتہ باقاعدہ ایک مشن کی شکل دینے کا موقع ان میں سے کسی کو نہیں ملا؛ جس کے مثبت اور منفی دونوں طرح کے نتائج آج امت کے سامنے ہیں۔

بہر کیف یہ تو ایک ذیلی اور ضمنی بات تھی، بات تو یہ چل رہی تھی کہ مولانا ابو المحاسن سجادؒ کا نظریہ تھا کہ "جب تک حکومتِ کافرہ کا مسلمانوں پہ تسلط ہے اور جب تک مسلمان اس ابتلاء میں مبتلا ہیں اور جس وقت تک مسلمان اپنے سیاسی اقتدار کے مالک نہیں ہو جاتے، اس وقت تک اپنے اقتصادی اور معاشرتی کاموں کے لیے ایک امیر منتخب کریں اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری پہ بیعت

کریں، تاکہ اس کفرستان میں جس قدر ممکن ہو سکے اپنی زندگی شرعی بنا سکیں۔

۱۸۵۷ء کے اس انقلاب کے بعد جو ہندوستان میں ظہور پذیر ہوا اور جسکے نتیجہ میں مسلمانوں کی دولت، ان کی عزت، ان کی شرعی زندگی اور ان کا سیاسی اقتدار ملیامیٹ ہو گیا، اسکے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ مسلمان مسجدوں کی امامت کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں ایک امیر بھی منتخب کرتے۔

بقولِ مولانا احمد سعید دہلوی مولانا ابوالمحاسن سجادؒ علماء کی جماعت کے وہ پہلے عالم تھے جنہوں نے وقت کی مناسبت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کام کو شروع کیا اور اسکی حمایت میں آواز بلند کی۔ (حیاتِ سجاد ۹۴)

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی مرحوم جن کو نہ صرف مولانا سجادؒ سے جسمانی قرب رہا ہے، بلکہ جن کے ذہن و دماغ کی آئینی ساخت و پرداخت میں مولانا سجادؒ کی صحبتوں کا خاص اثر معلوم ہوتا تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ :

"مولانا (سجادؒ) کا عقیدہ تھا کہ ہندو اور مسلمان کی دو جداگانہ معاشرتیں ہیں، اس لیے ان کی اصلاح بھی جداگانہ قوانین کے ذریعہ ہونی چاہیے۔ مولاناؒ اس بات کے لیے برابر کوشاں رہے کہ یہ اصول اسمبلی میں رواج پا جائے۔ مولانا کا یہ بھی خیال تھا کہ اصولاً ایک فرقہ کے معاشرتی قانون میں دوسرے فرقہ کے رکن کو ووٹ دینے کا حق نہ ہونا چاہیے۔" (حیاتِ سجاد ص : ۱۵۰)

مولاناؒ کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کی غیر معمولی دینی غیرت و حمیت بھی تھی جس کا اظہار مولاناؒ سے بے ساختہ ہو جایا کرتا تھا۔

یہ مولانا ابوالمحاسن سجادؒ کا ہی حوصلہ تھا کہ بھری مجلس میں ایک بڑے لیڈر کو خطاب کر کے یہ کہیں :

"سال بھر میں صرف ایک دفعہ گائے کی قربانی سے ڈاکٹر صاحب کا خون کھول جاتا ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب کو یاد رکھنا چاہیے کہ ایک مسلمان جب بازاروں میں، دریا کے کنارے اور آبادی میں گذرتا ہے تو ہر قدم پر اس کا خون کھولتا ہے، جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ کہیں پتھروں اور مورتیوں کو پوجا جا رہا ہے، کہیں دریا کی موجوں کی پوجا ہو رہی ہے، کہیں درختوں کو پوج کر اس کے خدا کے حقوق کو پامال کیا جا رہا ہے، لیکن مسلمان ان سب کو اس لیے برداشت کرتا ہے کہ اب تک وہ اس سلوک کا عادی ہے جو حکمران ہونے کی حیثیت سے غیر مذاہب کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اگر ہندو مطالبہ کرتے ہیں کہ مسلمان گائے کی قربانی ترک کر کے ان کے جذبات کا احترام کریں، تو انہیں بھی غیر اللہ کی پرستش چھوڑ کر مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرنا پڑے گا۔ (حیاتِ سجاد ص : ۵۰)

ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں :

"ہندو کے خیال سے کہ ان کا دل دکھتا ہے، ذبح گاؤ کو ترک کرنا قطعاً حرام ہے، کیوں کہ اس کی صورت میں تائید علی الشرک ہوتی ہے اور مشرکین کی ہوا پرستی کی باتوں کو تسلیم کرنا اور ماننا بالکل ناجائز ہے۔ گاؤ رکھشا اور گاؤ کو بچانے کا مسئلہ ہندوؤں کی ہوا پرستی پر مبنی ہے، یعنی گاؤ کے اندر وہ ایک خاص عظمت سمجھ کر قابل پرستش سمجھتے ہیں، پس جب تک ہندوؤں کے اندر جذبہ گاؤ پرستی موجود ہے، اس وقت تک ذبح گاؤ سر زمین ہند میں ایک شعارِ توحید اور شعارِ اسلام ہے۔ اللہ فرماتا ہے: وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ٥" (حیاتِ سجاد ص: ۴۶)

پھر حضرت مجدد الفِ ثانیؒ کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں، جس میں یہ الفاظ ہیں:

"ہندوستان میں اسلام کے بڑے شعائر میں سے ایک شعار ذبح گاؤ ہے، کیونکہ کفار جزیہ دینا شاید منظور کر لیں، لیکن گائے ذبح کیے جانے پر ہرگز ہرگز رضامند نہ ہوں گے۔"

(حیاتِ سجاد: ۴۷)

مولانا محمد سجادؒ کا جذبۂ ایمانی اس پائے کا تھا کہ وہ خلافِ شریعت کسی بات کو گوارا کرنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے تھے۔ آنکھوں سے دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ گاندھی جی نے جب مولانا محمد علی اور دوسرے مسلمان لیڈروں کے ساتھ ملک کا دورہ کر کے مسلمانوں کو اس بات کی تبلیغ کا ارادہ کیا کہ وہ ہندوؤں کی خاطر گائے ذبح کرنا ترک کر دیں، تو پھر کیا ہوا مولانا مضطرب ہو گئے اور نہ معلوم ان کے فکر و تدبر کے عمیق سمندر میں چند منٹ کے اندر ایک تلاطم اٹھا کہ چہرہ تمتما اٹھا، پیشانی پر بل پڑ گیا اور حسب عادت ہونٹوں کو دانتوں کے نیچے دبا لیا اور بول اٹھے کہ یہ نہایت ہی خطرناک فتنہ ہے، جس کی پوری قوت سے پہلے ہی قدم پر دبا دینا چاہیے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ:

(مولانا) اخلاق کے پیکر تھے، انکسار فطرت بن گیا تھا، مگر جرأتِ حق اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے بارے میں ایک بپھرے ہوئے شیر اور مردِ مجاہد تھے، اصابت اور فکر بلند کے حامل اور علم و عمل کی چلتی پھرتی مشین تھے۔ (حیاتِ سجاد ص: ۸۴)

سیاسی مجلسوں اور کانفرنسوں میں جس طرح کی خلاف شرع باتیں برداشت لی جاتی ہیں یا مداہنت گوارا کی جاتی ہے، اس بارے میں فرمایا:

"میں تو اس بارے میں ادنیٰ درجہ کی رواداری کو بھی مداہنت سمجھتا ہوں۔"

پھر فرمایا کہ ایک دفعہ اس طرح کا واقعہ پیش آیا تو میں نے خاموشی جائز نہ سمجھی اور فوراً کہہ دیا

کہ یہ چیز غلط اور معصیت ہے، پھر یک رفت آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور فرمایا کہ فسق والحاد کے عموم وشیوع کی وجہ سے ہمارے دینی حس بڑی حد تک ماؤف ہو چکی ہے اور مجھے توبسا اوقات شبہ ہوتا ہے کہ ہم لوگوں میں ایمان کا ادنیٰ درجہ بھی ہے یا نہیں۔ (حیاتِ سجاد ص: ۱۹۰)

مولانا کی یہی وہ ایمانی کیفیت اور قلب ودماغ کی طہارت وپاکیزگی تھی جس کو دیکھ کر مولانا مسعود عالم ندویؒ فرماتے ہیں:

"دو چار ملاقاتوں میں جا کے ان کے ذہن ودماغ کی بلندی کا صحیح احساس ہو پاتا اور کہیں انہوں نے آپ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا پھر تو بے اختیار جی چاہتا کہ علماء، زعماء کی ساری جماعت اس فردِ واحد پر نچھاور کر دی جائے۔" (حیاتِ سجاد ص: ۱۹۰)

مولاناؒ پیکر عمل بن کر غیب کی صدا ہو گئے تھے، اس لیے ان کی ہر بات میں عجیب طرح کی خنکی اور تاثر لوگوں کو محسوس ہوتی تھی۔ مولانا مسعود عالم ندویؒ لکھتے ہیں:

"جامع مسجد میں جلسہ ہوا، مولانا دو گھنٹے تقریر کی، سارا مجمع پتھر کی مورت بنا ہوا تھا، میں نے اپنی زندگی میں خطابت اور اس کی تاثیر کا بالکل نیا نمونہ دیکھا۔ زبان میں لکنت، بیان میں سادگی، نہ ابوالکلامؒ کی خطابت اور اس کی تاثیر، نہ بخاریؒ کے چٹخارے، نہ احمد سعیدؒ کی زبان، مگر مجمع ہے کہ دم بخود ہے اور ہاں، ہاں کر رہا ہے اور مجمع بھی کیسا، تحریک کے مخالفوں کا۔ میں بار بار مولاناؒ کی طرف حیرت سے دیکھتا تھا اور دل میں ان کی عظمت بیٹھی جاتی تھی۔ اس تقریر سے میری معلومات میں بڑا اضافہ ہوا۔"

مولاناؒ سجادؒ کے علم وفکر اور سیرت وکردار کی یہ محض چند جھلکیاں ہیں جو ان کے معاصرین کی شہادتوں سے جمع کی گئی ہیں، لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومتِ الٰہیہ کے بارے میں ان کے تصور اور پھر امارتِ شرعیہ کے مثالی نظام کا باقاعدہ تحلیل وتجزیہ کیا جائے، جس سے واضح ہو سکے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین کے درمیان مولانا سجادؒ کا مقام کتنا بلند ہے اور یہ حقیقت بھی عیاں ہو جائے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا میں جہاں کہیں بھی مسلم اقلیتیں آباد ہیں، ان کے لیے قابل عمل اور ان کی حفاظت کا ضامن صرف وہی لائحۂ عمل ہے جو مولانا سجادؒ نے امارتِ شرعیہ کی شکل میں پیش کیا ہے اور بلاشبہ یہ ان کا ایسا امتیاز ہے جس میں اس صدی کے مسلم مفکرین میں کوئی دوسرا ان کا ہم پایہ نظر نہیں آتا ہے۔

ہماری دعا ہے کہ ان کا آباد کردہ امارتِ شرعیہ کا یہ چمن قیامت تک لوگوں کی رہنمائی کا ذریعہ بنا رہے۔

این دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

سوال وجواب

دارالافتاء دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد

مساجد میں سازوالی گھڑیاں اور موبائیل فون

سوال : مساجد میں لگی یا موسیقی جیسی آواز بجانے والی گھڑیاں نصب کی جاسکتی ہیں ؟ نیز مساجد میں گھڑیوں کے گھنٹے بجنا اور موبائیل فون و پیجر کا الارم بجنا بھی کیسا عمل ہے ؟ مساجد میں لگائی جانے والی گھڑیاں کیسی ہونی چاہیے ؟ شرعی حکم صادر فرمائیں تو نوازش ہوگی۔

(عبدالهادی بن محمد شحبل ، بارکس ، حیدرآباد)

الجواب وباللہ التوفیق : مساجد اللہ کا گھر ہیں ، ان کا احترام اور ہر طرح کی ناپسندیدہ چیزوں سے مساجد کی حفاظت واجب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجدوں میں گم شدہ چیزوں کے اعلانات سے بھی منع فرمایا ہے ، بلکہ فرمایا ہے : اگر کوئی گم شدہ چیز کا اعلان کرے تو کہہ دو کہ اللہ تم کو وہ چیز نہ ملائے ، لا ردّھا علیك (مسلم عن ابی ہریرۃ) اور مسجد کا یہ حق قرار دیا کہ وہاں اللہ کا ذکر کیا جائے۔ آپؐ نے فرمایا کہ جب تم جنت کی کیاری سے گذرو تو وہاں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چلو ، پھر فرمایا کہ مسجدیں جنت کی کیاریاں ہیں اور ان کیاریوں میں تفریح "سبحان اللہ والحمد للہ لا الہ الا اللہ اللہ اکبر" ہے (ترمذی عن ابی ہریرۃؓ) نیز آپؐ نے مسجد میں دنیوی اشعار کے پڑھنے سے بھی منع فرمایا (ترمذی عن عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ) ان احادیث سے معلوم ہوا کہ مسجد اللہ کے ذکر کی جگہ ہے اور ایسی تمام باتیں جو دنیوی بات شمار کی جاتی ہوں اور امورِ دنیا کے قبیل سے ہوں ، مسجد میں ان کا کرنا جائز نہیں۔

جہاں تک مسجد میں ایسی گھڑی لگانے کی بات ہے کہ جس میں ہر گھنٹے میں صرف "گھنٹہ" بجا کرتا ہے، تو اس کی گنجائش ہے، اس لیے کہ یہ ایک ضرورت ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں کسی غلطی کے پیش آنے پر خواتین کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ ایک ہاتھ کی پشت پر دوسرے ہاتھ سے تھپتھپائیں، لیکن ایسی گھڑی جس میں موسیقی اور ساز کی آواز ہو، مسجد میں لگانا مکروہ ہے، کیوں کہ یہ گانے بجانے کے قبیل سے ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی چیزوں سے تو عام حالات میں بھی منع فرمایا ہے، اس لیے اس کی ممانعت مسجد میں بدرجۂ اولیٰ ہوگی، اس سے نماز اور ذکر و تلاوت میں مشغول لوگوں کی توجہ بھی ہٹ جاتی ہے۔

اسی طرح مسجدوں میں موبائیل اور پیجر کو بند کر دینا چاہیے کہ اس آواز سے نماز پڑھنے اور ذکر کرنے والوں کو خلل واقع ہوتا ہے اور پھر اس پر جو پیغام (Massage) آئے، وہ عام طور پر دنیوی کاموں ہی سے متعلق ہوگا اور آپ ﷺ نے مسجدوں میں دنیوی باتیں کرنے سے منع فرمایا ہے، اس لیے یہ بھی مسجد میں مناسب نہیں۔ واللہ اعلم

حررہ خالد سیف اللہ رحمانی
الجواب صحیح عبد الودود مظاہری

قرآن کا عالمی یا قومی مسابقہ منعقد کرانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماءِ دین کہ آج کل بعض ادارے قرآن مجید کی تلاوت، حفظ اور تفسیر قرآن کے مسابقات منعقد کر رہے ہیں، ان مسابقات کا مقصود طلبہ میں قرآن مجید کے پڑھنے اور سمجھنے کا ذوقِ سلیم پیدا کرنا ہے، ایسے مسابقات منعقد کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

(محمد عبد الرحیم فلاحی، گجرات)

الجواب وباللہ التوفیق: شریعت میں جو امور مطلوب اور پسندیدہ ہیں، وہ دو طرح کے ہیں، بعض وہ ہیں جن کے مقاصد بھی متعین ہیں اور طریقہ بھی، جیسے نماز، روزہ وغیرہ، نماز کا مقصد فحشاء اور منکر سے بچنے کا ملکہ پیدا کرنا ہے، اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَ الْمُنْكَرِ (العنکبوت: ۴۵) اور نماز پڑھنے کا تفصیلی طریقہ بھی احادیث میں مذکور ہے، روزہ کا مقصد تقویٰ پیدا کرنا ہے، كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرۃ: ۱۸۳) اور آیات و احادیث میں

تفصیل کے ساتھ روزہ کا طریقہ اور احکام و مسائل کی بھی وضاحت فرمائی گئی ہے، بعض امور وہ ہیں کہ شریعت نے مقصد تو متعین کر دیا ہے، لیکن اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے کیا طریقہ کار ہو، اس کی تحدید و تعیین نہیں کی ہے، جیسے تعلیم و تبلیغ، کہ تعلیم کا مقصد تفصیلی ہدایت اور تبلیغ کا مقصد اجمالی ہدایت ہے، لیکن اس کے لیے نماز، روزہ کی طرح شرائط، ارکان و واجبات اور سنن و مستحبات مقرر نہیں، صرف کچھ بنیادی اصول و قواعد کی رہنمائی کی گئی ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ شریعت نے ان امور میں طریقہ کار کی بابت وسعت کی راہ اختیار کی ہے، کہ جہاں جیسے مواقع ہوں وہاں شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے مناسب تدابیر اختیار کی جائیں، کیوں کہ یہی حکمت و مصلحت کا تقاضا بھی ہے۔ ایک کم عمر بچہ اور معمر شخص کی تعلیم کا نہج ایک ہی نہیں ہو سکتا اور ایک جاہل اور پڑھے لکھے پر تبلیغ کے لیے ایک ہی اسلوب کا اختیار کرنا مفید اور موثر نہیں ہوگا، بلکہ اگر ہر جگہ ایک ہی طریقہ کا تجربہ کیا جائے تو اس سے فائدہ کے بجائے نقصان اور نفع کے بجائے ضرر کا اندیشہ ہے۔

جیسا کہ مذکور ہوا تعلیم کا مقصد متعین ہے کہ انسانیت کو سرچشمۂ ہدایت تک پہنچا دیا جائے اور ظاہر ہے کہ ہدایت کا سب سے بڑا سرچشمہ قرآن و حدیث ہے، لیکن قرآن و حدیث کی طرف لوگوں کو کس طرح راغب کیا جائے؟ اس کی کوئی ایک ہی صورت متعین نہیں، ہر زمانہ کے حالات اور مزاج و مذاق کے اعتبار سے ترغیب و تحریص کے وسائل مختلف ہو سکتے ہیں۔ "مسابقۃ القرآن" کا جو سلسلہ عالم عرب میں اور گذشتہ کچھ سالوں سے بعض ذمہ دار اداروں کی طرف سے ہندوستان میں شروع کیا گیا ہے، اس کا مقصد تفاخر و مباہات نہیں بلکہ تسابق اور مسابقت فی الخیرات ہے۔ اس کے ذریعہ دینی مدارس کے طلبہ میں قرآن کی تلاوت و تحفیظ اور فہم کا بڑھتا ہوا ذوق مشاہد ہے۔ اس لیے یہ ارشادِ ربانی: وَلٰكِنْ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (المائدۃ: ۱۴۸) کی تعمیل سے عبارت ہے اور وہ تمام امور جو طاعات کے قبیل سے ہوں، خیرات میں داخل ہیں۔ (دیکھئے تفسیر قرطبی: ۶/۲۱۱)

علم دین کے معاملہ میں ایک دوسرے پر مسابقت کی کوشش کا جائز ہونا احادیث سے بھی ثابت ہے؛ چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ دو ہی آدمیوں پر رشک جائز ہے اور ان میں سے ایک اس شخص کا ذکر فرمایا جس کو اللہ تعالیٰ نے حکمت یعنی علم دین عطا فرمایا ہو کہ وہ اس کے ذریعہ معاملات کے فیصلے کرے اور دوسروں کو علم کے زیور سے آراستہ کرے، رجل آتاہ اللہ الحکمۃ فھو یقضی بھا و یعلمھا

(بخاری : ۱/ ۱۷) دینی مدارس میں امتحانات اور امتیازی کامیابی پر انعامات کی اصل بھی یہی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد مواقع پر نیک کاموں کے لیے اور خاص کر قرآن کی نسبت سے ایسے ترغیبی وسائل کا اختیار کرنا ثابت ہے۔

(۱) آپ نے بعض قافلوں پر ایسے شخص کو امیر بنایا جن کو زیادہ قرآن یاد تھا، حالانکہ وہ کم عمر تھے اور ان سے زیادہ سن رسیدہ اور تجربہ کار لوگ اس قافلہ میں شریک تھے۔

(۲) اسلام میں امامت نہایت ہی اعزاز کا کام اور احترام کا مقام ہے، اگر امیر المومنین ہو تو وہ یا اس کا نائب ہی امامت کا اولین حق دار ہے؛ اس سے اس منصب کی اہمیت اور عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ امامت کے لیے بھی آپؐ نے ایسے شخص کو زیادہ مستحق قرار دیا جو زیادہ بہتر طور پر قرآن پڑھ سکتا ہو۔ (ابو داؤد : ۱/ ۸۶)

(۳) وفات اور شہادت کے بعد بھی آپؐ نے قرآن کی نسبت سے اعزاز و اکرام کا معاملہ فرمایا؛ چنانچہ غزوۂ احد کے شہداء کی کثرت کی وجہ سے جب ایک قبر میں دو دو شہید کی تدفین عمل میں آئی تو آپؐ نے ہر قبر میں سمت قبلہ کی طرف اس شخص کو آگے رکھا جس کو قرآن مجید زیادہ یاد تھا۔ (بخاری : ۲/ ۵۸۴)

(۴) جہاد بھی ایک اہم ترین اسلامی عبادت ہے۔ آپؐ نے مجاہدین کی حوصلہ افزائی کی غرض سے اعلان فرمایا کہ جو شخص کسی دشمن کو قتل کرے تو وہ اس مقتول کے "سلَب" یعنی مقتول کے جسم پر موجود ہتھیار اور سامان کا مالک ہو گا، من قتل قتیلا فلہ سلبہ (الموطا : ۱۷۰)

(۵) اسی طرح آپؐ نے مجاہدین میں جذبۂ مسابقت پیدا کرنے کے لیے ایسا بھی فرمایا ہے کہ کسی قلعہ کے فاتحین یا جنگ کے آخری لمحہ میں دشمن پر آخری حملہ کرنے کے لیے پورے مالِ غنیمت کا کچھ حصہ جیسے تہائی یا چوتھائی انعام کے طور پر دینے کا وعدہ فرمایا۔

(۶) گھوڑ دوڑ، تیر اندازی اور دوڑ وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو جہاد میں ممد و معاون ہیں، ان کی مشق کے لیے آپؐ نے مقابلے کرائے ہیں اور ان میں مسابقہ کی ترغیب بھی دی ہے۔ (ابو داؤد : ۱/ ۳۴۸)

(۷) غزوۂ احد کے موقعہ سے بعض کم عمر صحابہ جہاد میں شرکت کے لیے بے قرار تھے اور آپؐ کمسن بچوں کو شریک نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ اس موقعہ سے حضرت سمرہؓ اور حضرت رافعؓ کی کشتی کا مقابلہ کرایا گیا اور حضرت سمرہؓ کو اس مقابلہ میں جیتنے کی بنیاد پر غزوۂ بدر میں شرکت کی اجازت مرحمت فرمائی گئی۔

(سیرتِ ابن ھشام : ۳/ ۱۱)

(۸) حضرت عمرؓ نے اپنی مجلس شوریٰ میں اکابر صحابہ کے ساتھ حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کو قرآن کے فہم خاص ہی کی وجہ سے شامل فرمایا اور جب بعض ارکان کو مجلس شوریٰ میں ان کی شمولیت گراں گذری تو حضرت عمرؓ نے سورۂ نصر کی تفسیر پوچھ کر باضابطہ امتحان لیا۔ اس امتحان میں حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ بمقابلہ دوسرے ارکان کے زیادہ پورے اترے۔ (بخاری : ۲ / ۷۴۳)

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے حفظ و تلاوت اور ترجمہ و تفسیر کا ذوق پیدا کرنے کے لیے مسابقات کا منعقد کرنا نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے، کیوں کہ جو چیز کسی مستحسن بات کا ذریعہ بنا کرتی ہو وہ خود بھی مستحسن ہوتی ہے۔ یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ جو طلبہ مسابقہ میں شریک ہوتے ہیں، ان میں تفاخر کی نیت کا پایا جانا ممکن ہے اور طاعات میں تفاخر و مباہات جائز نہیں، کیوں کہ "تعلیم قرآن" اتنا بلند مقصد ہے کہ اس کے لیے وقتی طور پر بعض مکروہات کو بھی گوارا کیا جا سکتا ہے، اسی لیے فقہاء نے تعلیم کی غرض سے چھوٹے بچوں کو قرآن دینے کی اجازت دی ہے۔ (الاشباہ والنظائر لابن نجیم : ۷۷) حالانکہ بچوں کو قرآن دینے میں بے احترامی کا اندیشہ ہی نہیں، گمانِ غالب ہے، لیکن مقصد تعلیم کے لیے اس کو بھی گوارا کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلم رؤساء کو دعوتِ اسلام کے جو خطوط لکھے، ان میں آیاتِ قرآنی بھی درج تھیں، حالانکہ مکتوبِ مبارک کے ساتھ بے احترامی کا اندیشہ موجود تھا، بلکہ کسریٰ نے بے احترامی کا ارتکاب بھی کیا۔ معلوم ہوا کہ تعلیم و تبلیغ کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے ایسے اندیشے گوارا کیے جا سکتے ہیں۔ ممکن ہے آج ایک طالب علم تفاخر کا جذبہ رکھتا ہو، لیکن جب عمدگی کے ساتھ قرآن پڑھنا آجائے گا اور بتدریج تربیت ہوتی جائے گی تو انشاء اللہ آئندہ قرآن کا ذوق باقی رہے گا اور نیت کا کھوٹ دور ہو جائے گا۔ واللہ اعلم وبہ التوفیق

حررہ خالد سیف اللہ رحمانی

الجواب صحیح عبد الودود مظاہری

سری نمازوں میں قراءت

سوال : سری نمازوں میں اگر نمازی اپنی ہونٹ کو حرکت نہ دے اور منہ بند کر کے نماز پڑھے یا پڑھائے، تو ایسی قراءت کے ساتھ نماز ہوگی یا نہیں ؟

(حبیب الرحمٰن، سکندر آباد)

الجواب وباللہ التوفیق: قراءت کے صحیح ہونے کے لیے زبان سے قراءت کرنا ضروری ہے، سری نماز ہو تو آہستہ آواز کے ساتھ اور جہری نماز ہو تو بلند آواز کے ساتھ۔ جہری نمازوں میں قراءت کے لیے ہونٹ اور زبان کا حرکت کرنا تو واضح ہے کہ اس کے بغیر جہری قراءت کہلائے گی ہی نہیں، لیکن سری نمازوں میں بوقتِ قراءت ہونٹ میں حرکت کا ہونا ضروری ہے، دل ہی دل میں منھ بند کر کے قراءت کرنا کافی نہیں؛ اس لیے اگر منھ بند ہو، ہونٹ بھی حرکت نہ کرے تو قراءت نہیں اور قراءت نہیں تو ایسی صورت میں نماز بھی درست نہ ہوگی۔ علامہ شامیؒ تحریر فرماتے ہیں: و أدنی الجهر اسماع غیرہ و أدنی المخافة اسماع نفسه (شامی جلد دوم، فصل فی القراءة)

حررہ اشرف علی قاسمی

الجواب صحیح خالد سیف اللہ رحمانی

عبد الودود مظاہری

خبر نامہ

سرفراز احمد قاسمی

دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد

شوال تا ذوالحجہ ۱۴۱۹ھ

- ۱۱ر شوال ۱۴۱۹ھ کو حسب معمول جامعہ ہٰذا کھل گیا اور تمام تعلیمی شعبہ جات میں داخلہ کی کاروائی شروع ہوگئی، سال رواں حسب گنجائش مختلف شعبہ جات میں درجِ ذیل تعداد میں طلبہ کے داخلے لئے گئے۔

شعبۂ اختصاص فی الفقہ	اول	۱۴	شعبۂ حفظ	۲۲۵
" " "	دوم	۵	شعبۂ روضۃ الاطفال	۲۵۰
شعبۂ عالمیت		۱۹۸		

اس طرح جملہ ۶۹۲ طلبہ کے داخلے لئے گئے، جن میں ۵۶۷ طلبہ دار الاقامہ میں قیام کرتے ہیں جن کے قیام و طعام اور علاج و معالجہ کی کفالت جامعہ ہٰذا کرتا ہے۔

- ۲۹ر شوال ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۷ر فروری ۱۹۹۹ء روز چہارشنبہ کو افتتاح تعلیم کی نسبت سے جمیع طلبہ و اساتذہ کا سمینار ہال میں اجتماع ہوا، جس سے جامعہ ہٰذا کے مختلف مؤقر اساتذۂ کرام نے طلبہ کو فضیلت علم اور حصولِ علم کی مناسبت سے کتاب و سنت کی روشنی میں مفید نصیحتیں کیں اور اپنے طویل تجربات کی روشنی میں قیمتی مشورے دئے۔ جامعہ ہٰذا کے ناظم حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب مدظلہٗ کی خواہش پر جامعہ ہٰذا کے مؤقر اور استاذ الاساتذہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب قاسمی نائب شیخ الحدیث جامعہ ہٰذا نے طلبۂ دورۂ حدیث کو بخاری شریف کی ابتدائی حدیث پڑھا کر بخاری شریف کا افتتاح فرمایا، آخر میں حضرت ناظم صاحب مدظلہٗ کے خطاب کے بعد حضرت مولانا محمد برکت اللہ صاحب کی دعا پر یہ بابرکت اجتماع اختتام پذیر ہوا۔

- ۱۹ر ذوقعدہ ۱۴۱۹ھ مطابق ۸ر مارچ ۱۹۹۹ء کو ممتاز عالم دین اور دانش ور ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی ریڈر جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی کی تشریف آوری ہوئی اور جامعہ ہٰذا کے طلبہ سے توسیعی خطاب بعنوان "اہل علم اور عصری مسائل" فرمایا۔ اس اجلاس میں جامعہ ہٰذا کے تمام اساتذہ کے علاوہ شہر کے ممتاز

دانش ور حضرات اور اہلِ علم نے بھی شرکت کی۔

- ۲۰؍ ذوقعدہ ۱۴۱۹ھ کو کویت کی فلاحی تنظیم "لجنہ مسلمی آسیا" کے جنرل سکریٹری شیخ دعیج خلف الشمری تشریف لائے، ان کے اعزاز میں جامعہ ہٰذا کی جانب سے ایک استقبالیہ اجتماع ترتیب دیا گیا طلبہ کی نمائندگی کرتے ہوئے آصف رضا پنجم عربی اور ایاز احمد دورۂ حدیث نے عربی زبان میں تقریریں کیں اور آخر میں حضرت ناظم صاحب مدظلہٗ نے بھی ان کی آمد پر استقبالیہ کلمات فرمائے، بعد میں مہمان موصوف نے بھی طلبہ سے خطاب کیا۔
- ۲۲؍ ذوقعدہ ۱۴۱۹ھ کو دعوت و تبلیغ کی نسبت سے علماء کا ایک وفد آیا اور مہمانوں نے مسجد "عمر بن الخطاب" میں بعد نماز ظہر خطاب فرمایا۔
- ۲۱؍ ذوقعدہ ۱۴۱۹ھ انجمن الفلاح دار العلوم سبیل السلام کے ذمہ داروں کا انتخاب ہوا، اور درج ذیل طلبہ سالِ رواں کے لئے ذمہ دار منتخب ہوئے۔

شعبۂ اردو تقریر

ناظم: حافظ مطیع الرحمٰن (دورۂ حدیث)

معاون: حافظ شاہد حسین (ہفتم عربی)

شعبۂ عربی تقریر

ناظم: محمد عمر عابدین (دورۂ حدیث)

معاون: حافظ آصف رضا (پنجم عربی)

شعبۂ تحریر

ناظم: محمد عمران (ششم عربی)

معاون: محمد محی الدین (چہارم عربی)

" کبیر احمد (پنجم عربی)

ماہنامہ "معمار"

مدیر: افتخار احمد (ہفتم عربی)

معاون: حافظ انعام الحق (پنجم عربی)

ناظم کتب خانہ

ناظم: مقیم الدین (ششم عربی)

معاون: نصیر الدین (ہفتم عربی)

دعوت و تبلیغ

ذمہ دار: مولوی خالد سیف اللہ (تخصص اول)

معاون: حافظ خلیل کوثر (پنجم عربی)

- ۹؍ ۱۰؍ ۱۱؍ ذوقعدہ ۱۴۱۹ھ کو رابطہ ادب اسلامی کا اجلاس بنگلور میں منعقد ہوا، جس میں جامعہ ہٰذا سے جناب مولانا عبد الباسط صاحب ندوی اور جناب مولانا احمد عبد المجیب صاحب قاسمی ندوی، استاذ جامعہ ہٰذا نے شرکت کی، حضرت مولانا محمد برکت اللہ صاحب، قاسمی نے جمعیۃ العلماء ہند کے اجلاس عاملہ

میں شرکت کی غرض سے دہلی کا سفر کیا اور حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صدر مدرس جامعہ ہٰذا نے اسلامک فقہ اکیڈمی کے اجلاس کی تیاری کے سلسلہ میں ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دہلی کا سفر کیا۔

- فتح منزل میں حسب سابق حضرت صدر مدرس صاحب کا فقہی مذاکرہ ہر مہینہ کے دوسرے ہفتہ کو پابندی سے جاری ہے۔ جناب مولانا احمد عبد المجیب صاحب اور حضرت ناظم صاحب مدظلہ بھی کبھی کبھی اس اجتماع سے خطاب فرماتے ہیں۔

- الحق سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے اجلاس سے حضرت ناظم صاحب مدظلہ نے مورخہ ۱۶؍ ذو قعدہ ۱۴۱۹ھ کو خطاب فرمایا، دیگر مقررین میں جناب مولانا محمد سلمان الحسینی ندوی استاذ ندوۃ العلماء لکھنؤ اور جناب مولانا حمید الدین عاقل حسامی بھی تھے۔

- اس سال بھی حسب سابق جامعہ ہٰذا میں بڑے جانوروں کی قربانی کا اجتماعی نظم کیا گیا اور اطراف کے غرباء و مساکین میں گوشت کی تقسیم بھی ہوئی، شہر حیدرآباد کے مسلمانوں کی کثیر تعداد نے قربانی میں حصص لئے اور اپنی قربانی علماء کی نگرانی میں انجام دی۔

دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد

ایک نظر میں

بانی وناظم : مولانا محمد رضوان القاسمی

○ تعدادِ طلبہ (۶۹۲) ○ مقیم طلبار (۵۶۵) ○ اساتذہ ۳۱، دیگر عملہ ۲۷، سفراء ومبلغین ۷۔

شاخیں ــــ ۲۵، ۴ اقامتی، ۲۱ غیر اقامتی ــــ شاخوں میں مقیم طلبہ کی تعداد تقریباً (۳۰۰)

تعلیمی شعبہ جات

تخصص فی الفقہ، تخصص فی الدعوۃ، تخصص فی الادب، اردو اسلامیات کورس، عربی شعبے، عالمیت وفضیلت، مختصر مدتی عالم کورس (برائے طلبہ عصری مدارس)

تحفیظ القرآن، روضۃ الاطفال، شعبۂ تجوید، تدریب الائمہ۔

دیگر شعبہ جات

دارالافتار، کتب خانہ، دارالاقامہ، تعمیرات، طلبار کی انجمن "الفلاح"، دارالاشاعت، دارالمطالعہ، کمپیوٹر، شفاخانہ و دیگر فنی شعبہ جات (۷)۔

جرائد : ــــ سہ ماہی صفا (اردو) سہ ماہی صوت السلام (عربی)، سالنامہ معمار (طلبہ)

تعلیمی سال : ــــ شوال تا شعبان ○ مالی سال : ــــ شعبان تا رجب۔

سالانہ اخراجات : ــــ (۱/۲ ۵۸) لاکھ روپے (علاوہ تعمیرات) ○ سالِ آئندہ کا تخمینہ : ۶۵ لاکھ روپے۔

ذرائع آمدنی : ــــ (صرف عام مسلمانوں کا تعاون)

شائع کردہ : شعبۂ نشرواشاعت دارالعلوم سبیل السلام، عقب صلالہ، بارکس، حیدرآباد ۵

JAMIA ISLAMIA
DARULULOOM SABEELUSSALAM
Sabeel Nagar (Behind Salala, Barkas)
Hyderabad - 500 005 (A.P.) INDIA
Phone : 4440450 FAX : 0091-40-3203668

SAFA

1997
1.5.99

صفا

کسی بھی دینی درسگاہ میں حفظِ قرآنِ کریم کا شعبہ نہایت اہم ہوتا ہے اسی اہمیت اور قرآنِ کریم کی عظمت کے پیشِ نظر اس شعبہ کی مستقل عمارت کا زیرِ نظر نقشہ حسین و جمیل انداز میں تیار کیا گیا ہے، یہ نقشہ اندرونی حصہ کا منظر پیش کر رہا ہے۔



شائع کردہ: شعبۂ نشر و اشاعت دارالعلوم سبیل السلام عقب صلالہ بارکس حیدرآباد

JAMIA ISLAMIA
DARUL ULOOM SABEELUSSALAM
Sabeel Nagar (Behind Salala, Barkas)
Hyderabad - 500 005 (A.P.), India.
Phone : 4440450 Fax : 0091-40-3203668.